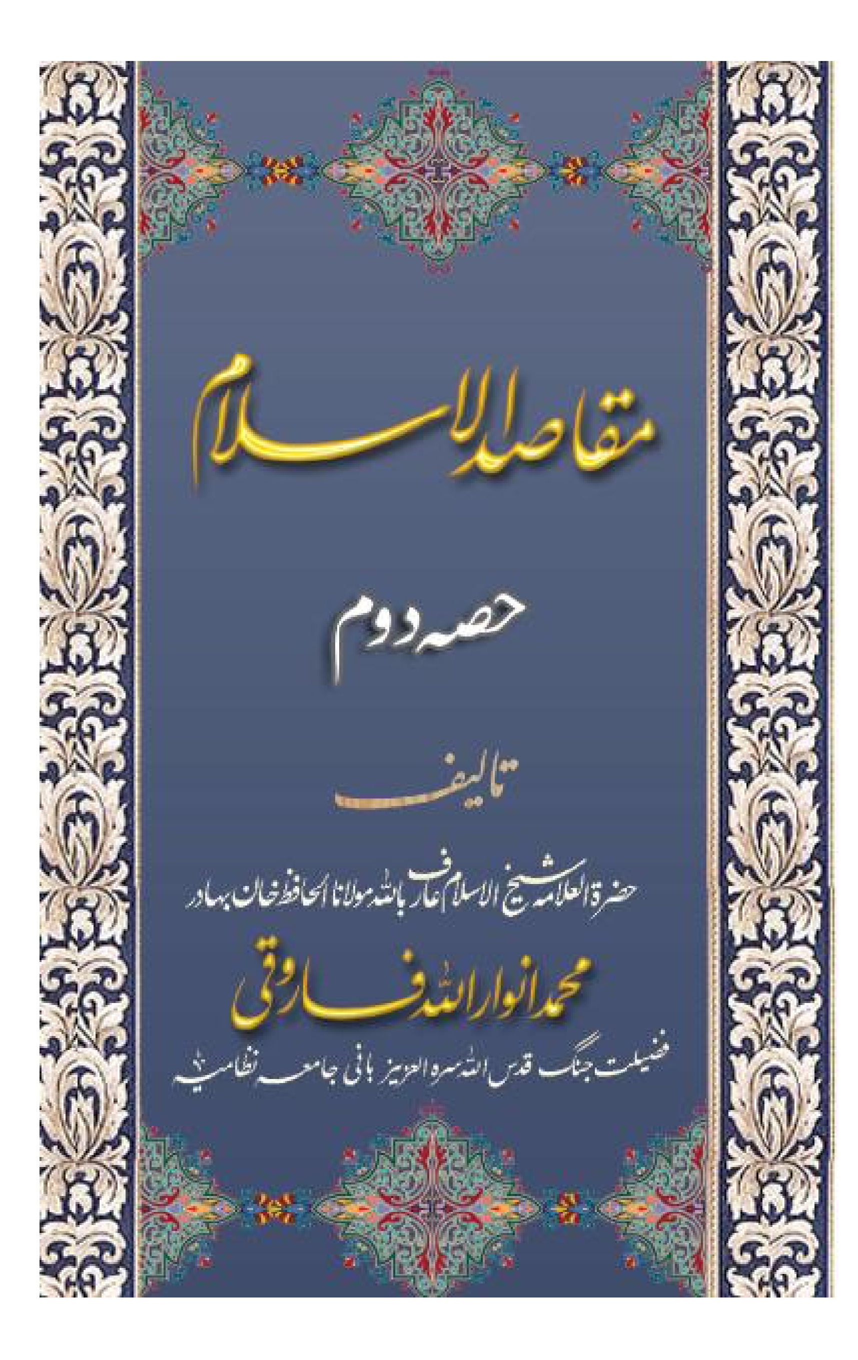

مقاصد الاسلام
حصہ دوم
تالیف
حضرۃ العلامہ شیخ الاسلام عارف باللہ مولانا الحافظ خان بہادر
محمد انوار اللہ فاروقی
فضیلت جنگ قدس اللہ سرہ العزیز بانی جامعہ نظامیہ

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین

درایت

امابعد، اس میں کوئی عقل مند شک نہیں کرسکتا کہ عقل جو آدمی کو عنایت ہوئی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے، اسی سے آدمی تمام حیوانات میں ممتاز اور ان پر حکمراں ہوا۔ بڑے بڑے تن آور، گردن کش ہاتھی جیسے جانور اس کے روبرو سر جھکاتے ہیں، اور بڑے بڑے خونخوار شیر واژدھے اس کے خوف کے مارے جنگلوں میں بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ عقل کی بدولت اس نے آسمانوں تک رسائی حاصل کی اور وہاں کے حالات بیان کرنے لگا، اسکی دوربین عقل نے نقطہ تک کو نہ چھوڑا جو صدہا دبیز وکثیف پردوں میں چھپا ہوا ہے یعنی وہ مرکز عالم تک کی خبریں دیتا ہے۔ بات بات میں وہ موشگافیاں کرتا اور بال کی کھال نکالتا ہے۔ قیاسات کی رصدگاہوں سے دور دور کے مضامین عالیہ کی سیر کرتا ہے۔ عقل ہی نے اس کو وحشیانہ رفتار سے روک کر تمدن کا پابند بنادیا' عقل ہی ہے کہ اخلاق حمیدہ کو اخلاق ذمیمہ سے علحدہ اور ممتاز کردکھاتی ہے' عقل سے آدمی اللہ کو

پہچانتا ہے اوراس کی مرضیات کو دریافت کر کے دارین کے منافع حاصل کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مخلوق میں کوئی ایسی چیز نہیں جو عقل سے زیادہ اللہ کی محبوب اور مکرم ہو (رواہ الحکیم الترمذی وداود۔ کذا فی شرح الاحیاء)

اس کے سواء اور بھی فضائل عقل کے باب میں احادیث وارد ہیں' عقل کی شرافت پر یہ قطعی دلیل ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں بکرات و مرات اپنی قدرت بالغہ کے آثار بیان کر کے فرمایا کہ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لئے ہیں جو عقل رکھتے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ ''اِنَّ فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل النھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیابہ الارض بعد موتھاوبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لاٰیات لقوم یعقلون'' ترجمہ: ''آسمانوں اور زمین کا بنانا' اور رات دن کا بدلتے آنا' اور کشتی جو لیکر چلتی ہے دریا میں جو چیزیں کام آئیں لوگوں کو' اور وہ جو اللہ نے اتارا آسمان سے پانی پھر جلایا اس سے زمین کو مر گئے پیچھے' اور بکھیرے اس میں سب قسم کے جانور' اور پھرنا ہواؤں کا' اور ابر جو

حکم کا تابع ہے درمیان آسمان اورزمین کے ان میں نشانیاں ہیں عقلمند لوگوں کو‘‘۔فی الحقیقت بیوقوفوں کا کام نہیں کہ کسی چیز کو دیکھ کر کوئی عمدہ نتیجہ نکال سکیں‘ وہ تو صرف جانوروں کی طرح دیکھ لیتے ہیں کہ آسمان و زمین وغیرہ بھی کوئی چیز ہیں‘ انہیں اس سے کیا تعلق کہ ان میں کیا کیا غوامض صنعت ہیں اوران کا بنانے والا کیسا حکیم ہے کہ بغیر مادے کے کس طرح بنایا ہوگا؟! کیونکہ یہ اس وقت کا کام ہے کہ سوائے خدائے تعالیٰ کے کوئی چیز نہ تھی‘ اس قسم کی باتیں سمجھنا عقلاء ہی کا کام ہے‘ اسی وجہ سے حق تعالیٰ بکمال عزت افزائی اپنی مصنوعات کو پیش کر کے ان کو توجہ دِلاتا ہے کہ ان میں غورو فکر کریں اور بحسب استعداد عقل سے مدد لے کر معلوم کریں کہ یہ اپنے مالک کی نشانیاں ہیں‘ جن سے ان کو اپنے خالق کے تقرب کی راہ بآسانی مل جائے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ حضرات نسخہء عالم کے مطالعہ میں ہمہ تن مشغول ہوگئے اوراس میں غور و فکر کرنے لگے‘ چونکہ ایک ایک پتہ بے انتہا صنائع و بدائع پر مشتمل تھا‘ جیسا کہ کسی بزرگ نے لکھا ہے ع۔

برگ درختان سبز درنظر ہوشیار

ہرورقے دفتریست معرفت کردگار

ہر چیز کے حسن وکمال صنعت نے ان کی نظر فکری کو ایسا لبھایا جیسے کسی

پری پیکر محبوبہ کا حسن و جمال نظر کو لبھا کر اپنا شیفتہ اور دیوانہ بنالیتا ہے جوں جوں وہ گہری نظریں مصنوعات پر ڈالتے گئے صنعت کی نئی نئی اعجوبہ کاریاں ان کے پیش نظر ہوتی گئیں جس سے مصنوعات میں صانع کا مشاہدہ ہر وقت ان کو ہونے لگا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ ہر چیز میں بلکہ جملہ حرکات وسکنات میں صفات الٰہیہ کے انوار ان کے پیش نظر ہوتے گئے' اس مشاہدہ سے ان کے تعلقات خدائے تعالیٰ کے ساتھ ایسے قوی اور مستحکم ہوگئے کہ جو کام وہ کرتے ہیں اس میں غفلت کو دخل ہی نہیں' اور کبھی بمقتضائے بشریت غفلت ہو بھی گئی تو ساتھ ہی متنبہ ہوجاتے ہیں' ان کے تمامی کاروبار خواہ دنیوی ہوں یا اخروی سب عبادت ہی عبادت ہوجاتے ہیں جس سے ہر وقت ان کو تقرب الٰہی حاصل رہتا ہے اور بی یسمع وبی یبصر وبی یبطش کا مضمون جو صحیح حدیث میں وارد ہے صادق آجاتا ہے' وہ دیکھتے ہیں سنتے ہیں اور سب کچھ کرتے ہیں مگر ان کے افعال کی حقیقت ہی کچھ اور ہوجاتی ہے،یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ اکابر دین نے جو کام کیئے وہ اب کسی سے نہیں ہوسکتے۔غرض کہ سالہا سال کی عبادت سے جو بات حاصل نہیں ہوسکتی' عقلاء کو مصنوعات الٰہیہ میں فکر و تدبر کرنے سے تھوڑی مدت میں حاصل ہوجاتی ہے اسی وجہ سے نبی کریم

ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایک ساعت کی فکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے‘‘۔ کیوں نہ ہو عبادت گو باعث تقرب ہے مگر اس میں اقسام کی خرابیاں مثل ریا کاری، تکبر، خود پسندی وغیرہ شریک ہوسکتی ہیں۔ بہ خلاف تفکر کے کہ وہ ان سب عوارض سے مبرا ہے اور اس سے وقتاً فوقتاً معرفت الٰہی کی زیادتی ہوتی رہتی ہے۔اور ظاہر ہے کہ معرفت ہی باعث محبت ہے جس کا حال ہم نے تقریر ایمان میں لکھا ہے، اور محبت پر وہ آثار مرتب ہوتے ہیں جو صرف عبادت پر نہیں ہوسکتے۔

بادی النظر میں یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اس قسم کی فکر میں رہتے ہیں وہ دنیا کی اعلیٰ درجہ کی نعمتوں سے محروم اور سعادت سے بے نصیب ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی دو چیزوں سے مرکب ہے ایک روح دوسرے جسم، اور جسم روح کے لئے گویا ایک آلہ یا مرکب ہے، اگر روح نہ ہو تو جسم بیکار اور جماد محض ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اصل آدمی روح اور نفس ناطقہ ہے جو جسم سے کام لیتا ہے اور جتنے تلذذات جسم سے متعلق ہیں وہ سب روح کے طفیلی ہیں۔اور ادنی تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ جو تلذذات خاص روحانی ہیں دراصل انسانی تلذذات وہی ہیں اور جسمانی تلذذات حیوانی ہیں۔اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کھانے پینے

جماع وغیرہ کے تلذذات کل حیوانوں کو حاصل ہیں جن کے حاصل کرنے میں وہ ہمیشہ ساعی رہتے ہیں، اور عقلی تلذذات، جو خاصہء انسانی ہے وہ کسی جانور کو حاصل نہیں ہوسکتے ہر چند مقتضائے انسانیت یہ تھا کہ ہر شخص جس طرح حیوانی تلذذات کے حاصل کرنے میں کوشش کرتا ہے اس سے زیادہ عقلی تلذذات کے حاصل کرنے میں کوشش کرتا، مگر چونکہ انسان پر ابتداء سے ایک مدت دراز تک ایسا زمانہ گزرتا ہے کہ اس کی نابالغ عقل اپنا ذاتی کام اس میں نہیں کرسکتی، اور جسمانی تلذذات اپنا ایسا لطف بتاتے رہتے ہیں کہ وہ ان کی کا دیوانہ بنا رہتا ہے، پھر جب ایک مدت دراز کے بعد عقل آئی تو وہ تازہ وارد مہمان کی طرح اپنا کوئی تصرف نہیں کرسکتی، اور اگر کوئی مشورہ دیا بھی گیا تو سالہا سال سے جن تلذذات نے اسے اپنا شیدا بنا رکھا تھا وہ کب اپنے دام سے نکلنے دیتے ہیں! پھر عادت خود بمنزلہ طبعیت ہوجاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ آدمی امور طبیعیہ کی طرف بالطبع مائل ہوتا ہے، اور عقل ان سے روک نہیں سکتی۔

غرض کہ اصلی تلذذات کی نوبت ہی نہیں آتی اور آدمی حیوانات کی طرح تلذذات جسمانی میں گرفتار رہتا ہے، مگر جن کی عقلیں کامل ہوتی ہیں ان کو انسانی تلذذات میں لطف آتا ہے، اور ان کا خود وجدان گواہی دیتا ہے

کہ ان تلذذات کے مقابلے میں جسمانی تلذذات کوئی چیز نہیں، اور جس طرح عوام الناس جسمانی تلذذات کے حاصل کرنے میں کوشش کرتے ہیں، وہ عقلی اور روحانی تلذذات کے حاصل کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔اور چونکہ دونوں کو پورے طور پر حاصل کرنا دشوار ہے اس لئے وہ تلذذات روحانی کو ترجیح دیکر ان ہی میں لگے رہتے ہیں،اور معمولی لوگ جن کی سرشت میں حیوانیت داخل ہے اور قواے حیوانیہ کے مغلوب ہیں وہ ان کو بیوقوف سمجھتے ہیں مگر وہ اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔

تاریخ فلاسفہء یونان میں سقراط کا حال لکھا ہے کہ وہ فقر وفاقہ میں خوش تھا کھانا جس قسم کا مل گیا کھالیا، گرماوسرما کا ایک ہی قمیص، پاؤں میں جوتا نصیب نہیں، کسی حکیم نے اس کی اس حالت پر طعن کیا،اس نے کہا کہ ’’شاید تو سمجھتا ہے کہ سعادت فقط تونگری اور لذتوں میں ہے؟ یہ غلط ہے اس وقت میں تجھ سے اچھی حالت میں ہوں‘‘۔دیکھئے سقراط اپنی حالت افلاس کو جو اچھی بتارہا ہے اس کا منشاء سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ عقلی تلذذات میں ایسا سرشار تھا کہ اس بے سروسامانی پر اس کی نظر پڑتی ہی نہ تھی،ایک ایک مسئلہ جو اس پر منکشف ہوتا تھا اس کی خوشی میں کسی چیز کا غم آنے پاتا ہی نہ تھا۔

فیثا غورث کا حال اسی کتاب میں لکھا ہے کہ جب اس نے اس دعویٰ پر برہان قائم کی کہ مثلث قائم الزاویہ میں وتر کا مربع دونوں ضلعوں کے مربع کے مساوی ہوتا ہے، تو اس کو اتنی خوشی ہوئی کہ بقول بعض شادی مرگ تک پہونچ گئی۔ دیکھئے علمی تلذذ یہاں تک پہنچتا ہے، ان لوگوں کے استغنا کی یہ حالت ہوتی ہے کہ پادشاہ کی بھی کچھ پروانہیں کرتے، چنانچہ دیوجینس کے حال میں اسی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ نامی مشہور فلاسفی تھا جس کے دیکھنے کے لئے سکندر شہر قورنیہ کو گیا تھا دیکھا کہ وہ دھوپ میں بیٹھا کچھ کام کررہا ہے، سکندر نے کہا میں سکندر اعظم ہوں، اس نے کہا میں دیوجینس ہوں، سکندر نے کہا کیا تو مجھ سے ڈرتا نہیں؟ کہا تو اچھا ہے یا برا ہے؟ کہا اچھے سے ڈرنے کی کیا وجہ؟ پھر چند باتیں کر کے سکندر نے رخصت کے وقت کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں بہت سی چیزوں کی احتیاج ہے اور مجھے بڑی آرزو ہے کہ تمہاری مدد کروں، اس لئے کوئی چیز تم مجھ سے طلب کرو! کہا میں آپ سے یہی درخواست کرتا ہوں کہ اس وقت آفتاب کے سامنے سے ہٹ جائیے اس لئے کہ مجھے دھوپ کی ضرورت ہے، بادشاہ اور اس کے رفقاء اس کی قناعت سے متعجب ہوئے۔ دیکھئے باوجود احتیاج اور بادشاہ کی درخواست کے کچھ طلب نہ کرنا اس بات پر قوی قرینہ ہے کہ

تلذذات جسمانی کی طرف ان کو ذرا بھی توجہ نہ تھی بلکہ یہ خوف تھا کہ کہیں تلذذات جسمانی، روحانی تلذذات کے مانع نہ ہو جائیں وہ پابندیوں سے بہت گھبراتے ہیں۔

چنانچہ افلاطون کے حال میں لکھا ہے کہ تحصیل علم کے لئے اس نے بہت سیاحت کی اور بعد فراغت ایک گاؤں میں اقامت گزیں ہوا جس کا نام اکدمیہ تھا، اور عمر بھر شادی نہیں کی۔ دیکھئے اگر عقلی تلذذ جسمانی تلذذ سے بڑھا ہوا نہ ہوتا تو کیا ممکن تھا کہ ایسا حکیم اس اعلیٰ درجہ کے تلذذات جسمانی سے دست بردار رہوتا۔

طالیس کے حال میں لکھا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جو لقب ''حکیم'' کا مستحق ہوا۔ جب ہیئت، ہندسہ وغیرہ علوم کی تحصیل کر کے گھر آیا تو اس کی عمر تیئیس ۲۳ سال کی تھی۔ ماں نے اسے شادی کرنیکا بہتیرا کہا مگر اس نے قبول نہ کیا اور عمر بھر مجرد اور حالت افلاس میں رہا، اس کا قول تھا کہ جو لوگ عقل رکھتے ہیں مال جمع نہیں کرتے بلکہ اس کو حقیر سمجھتے ہیں اور اکتساب علوم و معارف کو دوست رکھتے ہیں۔ دیکھئے مال کے جمع کرنے کو عموماً لوگ کیسی عقلمندی سمجھتے ہیں مگر اس حکیم نے حماقت قرار دی۔

دیموقریطس کے حال میں لکھا ہے کہ بعد تحصیل علوم اس نے زندگی

اس طرح بسر کی کہ کبھی کسی غار میں جا بیٹھتا، کبھی کسی قبر میں۔ ابن خلکان وغیرہ نے فارابی کے حال میں لکھا ہے کہ باوجودیکہ بادشاہ نے نہایت عاجزی سے ماہوار قبول کرنے کو اس سے کہا مگر اس نے اس پابندی کو قبول نہ کیا اور اکثر صحرا میں رہا کرتا تھا۔

غرض کہ اکثر اعلیٰ دماغ جو سرآمد روزگار تھے جن کے کارناموں کو خود حکماء وقعت کی نظروں سے دیکھا کہ ان کی تصریحات اور طرز عمل سے ظاہر ہے کہ تلذذات عقلی کے مقابلے میں تلذذات جسمانی کو وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے، اسی طرح عقلائے اسلام کا حال رہا کہ مصنوعات الٰہی میں نظر کرنے سے ان کو عقلی اور روحانی تلذذات ایسے حاصل ہوئے کہ جسمانی تلذذات کی طرف بالکل ان کی توجہ نہ رہی۔

مگر حکماء وفلاسفہ اور عقلائے اسلام میں یہ فرق ضرور ہے کہ وہ خانہ نشین یا صحرانوردر ہے، اور عقلائے اسلام کو اس کی ضرورت نہ تھی، ہر وقت اور ہر حالت میں صنائع اور قدرت وغیرہ صفات الٰہیہ کا مراقبہ کرتے کرتے ان کو اس قدر ملکہ حاصل ہو گیا تھا کہ جو کام وہ کرتے تھے اس میں جتنی صفات الٰہیہ اس کام سے متعلق ہیں سب پیش نظر ہو جاتی تھیں۔

توحید افعال وصفات وذات جس طرح قرآن وحدیث میں وارد ہے

اس پر پورا پورا ان کا اعتقاد تھا، اور موقعہ بہ موقعہ اس کو عمل میں لاتے تھے، ان کی عقلوں نے مان لیا تھا کہ خدائے تعالیٰ کی ذات وصفات تک اپنی رسائی ممکن نہیں، اس لئے خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ان سے متعلق جو کچھ خبر دی ہے اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے **الٓمّٓ ذلک الکتاب لاریب فیه هدیً للمتقین الذین یؤمنون بالغیب** یعنی ''اس کتاب میں کوئی شک نہیں وہ ان متقی لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں''۔ جو بات عقل سے باہر اور سمجھ سے دور ہو اس کو نہ مان کر بتاویل اپنی سمجھ کے مطابق بنائی جائے تو ایمان بالغیب سے اس کو کیا تعلق؟۔ غرض کہ صحابہ کو مصنوعات الٰہیہ میں خواہ وہ آفاق میں ہوں یا ان ہی کے نفسوں میں تفکر کرتے کرتے یہ ملکہ ہو گیا تھا کہ اپنے ہر کام میں خدائے تعالیٰ کے صفات اور افعال کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، جیسا کہ اس آیہ شریفہ سے مستفاد ہے قولہ تعالیٰ **ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف اللیل والنهار لاٰیات لاولی الالباب الذین یذکرون الله قیاماً وقعودا وعلی جنوبهم ویتفکرن فی خلق السمٰوات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلاً**

ترجمہ:۔ ’’آسمان اور زمین کا بنانا، رات اور دن کا بدلتے آنا، اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے، اور غور وفکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں: اے رب ہمارے تو نے یہ عبث نہیں بنایا‘‘۔ کیا یہ خیال ہوسکتا ہے کہ صحابہ باوجودیکہ بلاواسطہ سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ تھے وہ اس درجہ کے عقلاء اور اس تعریف کے مستحق نہ ہوں اور صرف چند گوشہ نشین فقراء کی تعریف اس آیہ شریف میں لی گئی ہو جو صحابہ کے بعد وجود میں آئے؟ ہرگز نہیں۔

اب غور کیا جائے کہ آدمی جو کام کرے گا وہ لیٹ کر کرے گا یا بیٹھ کر یا کھڑا ہوکر، غرض کہ ان ہی تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں کرے گا، پھر جب خدائے تعالیٰ نے خبر دی کہ ہر حالت میں وہ اللہ کا ذکر کیا کرتے ہیں تو اگر اس کے یہ معنیٰ خیال کئے جائیں کہ وہ لاالہ الااللہ وغیرہ اذکار کیا کرتے ہیں تو یہ لازم آئے گا کہ صحابہ کوئی دوسرا کام کرتے ہی نہ تھے! حالانکہ کسب معاش اور ملاقات احباب اور جہاد وغیرہ صدہا کام کیا کرتے تھے، اس صورت میں ذکر سے مراد مطلقاً ذکر اصطلاحی صوفیہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ذکر کے معنے لغت میں یاد کرنے

کے ہیں جو دل کا فعل ہے اور یہ ذکر کامل الایمان حضرات ہمیشہ کیا کرتے ہیں، اسلئے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے **وفی الارض آیات لقوم یؤمنون وفی انفسکم أفلا تبصرون** یعنی ''زمین میں نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو یقین کرتی ہے اور اپنی ذاتوں ہی میں تم کیوں نہیں دیکھ لیتے''۔ اس آیت کے لحاظ سے وہ ان اسرار پر جو ان کے نفوس میں رکھے ہیں ہمیشہ غور و فکر کیا کرتے ہیں۔ یوں تو آدمی میں بے انتہا قدرت کی نشانیاں ہیں جن کا کسی قدر حال فن تشریح الابدان یعنی اناٹومی اور فزیالوجی اور بیولوجیا اور اتنولوجیا اور بسیکولوجیا وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ ان سب کو جانے دیجئے صرف اسی کو دیکھ لیجئے کہ آدمی بدل ما یتحلل اپنے جسم میں پہنچانے کے لئے جب غذا کھاتا ہے تو اولاً اس کو پیٹ میں داخل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ہر چند عضلات وغیرہ جن سے یہ کام متعلق ہے آدمی کے اختیار میں ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی چیز کا نگلنا مشکل ہو جاتا ہے، پھر معدے میں وہ غذا پکتی ہے جس کے لئے آگ کی ضرورت ہے اور وہاں آگ ندارد، اور اگر ہے تو معدے ہی میں ہے، چنانچہ غذا کو گلا کر پاش پاش کر دیتا ہے اور معدے کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا پھر وہ باریک نلکیوں کی راہ سے جگر میں جاتی ہے، ہم دیکھتے

ہیں کہ بڑی بڑی موریوں کو ہر سال صاف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے،اوران کوصاف کرنے کی ضرورت ہی نہیں،اتفاقاً کبھی سدہ پڑبھی گیا تو دوا کے ذریعہ سے وہ نکال دیا جاتا ہے حالانکہ دوا کا اس موقعہ خاص میں جا کرکام کرنا کس قدر حیرت انگیز ہے، پھرجگرمیں وہ غذادوبارہ پکتی ہے اسی طرح دل میں،اور کچھ خبرنہیں ہوتی، پھروہی غذاتمام جسم میں تقسیم ہوتی ہے،کہیں اس سے گوشت بنتاہے کہیں ہڈی کہیں مغزکہیں منی وغیرہ، پھراسی غذاسے جودراصل ازقسم نباتات وغیرہ ہوتی ہے بچہ اور خاصہ انسان پیدا ہوتاہے،اورجس قدریہ انقلاب اوراستحالے ہوتے ہیں ان کی ذرابھی خبرنہیں ہوتی ہر چند خیال کیا جاتا ہے کہ طبیعت یہ سب کام کرلیتی ہے مگرطبیعت کا یہ حال ہے کہ نہ وہ جانور ہے نہ انسان،نہ جسم نہ جوہر۔اورطرفہ یہ کہ خود حکماء قائل ہیں کہ اس کوکسی بات کا شعور ہی نہیں۔قابل غوریہ بات ہے کہ ایسی بےشعوراورناواقف طبیعت ایسے کام کرتی ہے کہ ہزاروں حکیم اورڈاکٹرمل کران میں سے ایک کام کرناچاہیں تونہیں کرسکتے،معلوم نہیں عقل یہ کیونکر مان لیتی ہے کہ ایک مہمل چیزایسے نادراورحکیمانہ کام ہروقت کیا کرتی ہے۔طبیعت کو ماننے کا یہ سبب ہواہوگا کہ جب جسم میں کسی چیزکو داخل یا اس سے خارج کرنے کی

ضرورت ہوتی ہے تو ایک قسم کا تقاضا اور کیفیت آدمی اپنے میں پاتا ہے، چونکہ یہ ضرورتیں روزانہ پیش آتی ہیں اس لئے یہ قرار دیا گیا کہ یہ امور طبیعت سے متعلق ہیں حالانکہ یہ کیفیتیں ان ہی اعضاء میں محسوس ہوتی ہیں جن سے ادخال یا اخراج متعلق ہے، جس طرح کسی عضو میں اجنبی (غیر مانوس) اور غیر طبعی مادہ آنے سے درد کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، فرق اتنا ہی ہے کہ وہ معمولی کیفیت ہے اور یہ غیر معمولی، اس سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ مبدأ تمامی تدابیر کا ''طبیعت'' ہے۔ رہے نبض کی حرکات اور قارورے کے الوان وغیرہ سوان میں بھی طبیعت کو کوئی دخل نہیں، ہر ایک کے اسباب جداگانہ ہیں، مثلاً دل میں حرارت زیادہ ہوگی تو نبض ضرور زیادہ حرکت کرے گی۔ پھر ہمیشہ دیکھا جاتا ہے کہ اچھے خاصے صحیح تندرست آدمی کو خواہ مخواہ طبیعت مشورہ دیتی ہے کہ فلاں چیز کھا لیجئے یا فلاں کام کر لیجئے، اور جہاں اس پر عمل کیا فوراً کوئی بیماری یا آفت آ گئی! اگر مدبر بدن تھی تو ذرا سونچا ہوتا کہ اس کا وبال آخر مجھی پر آنے والا ہے سونچ سمجھ کر مشورہ دینا چاہیئے اگر کسی چیز کی خاصیت معلوم نہیں تو یہ مشورہ دیا جاتا کہ کسی طبیب سے پوچھ کر کھائیے! اور طرفہ یہ کہ اکثر ایسی ہی چیزوں کے استعمال کا مشورہ دیا کرتی ہے جو بارہا اپنے اور غیروں کے

تجربوں سے مضر ثابت ہوئیں۔مدبر کا تو یہ کام ہے کہ سوائے نفع کے نقصان کی چیز کو نزدیک نہ آنے دے۔ہاں یہ خالق عزوجل کی شان ہے کہ جو چاہے کرے،نہ کسی کے نفع سے کام نہ نقصان سے غرض،یفعل اللہ مایشاء و یحکم مایرید جب تک چاہا کام بنایا کیا اور جب چاہا فنا کردیا لایسئل عما یفعل ۔یہ تو سب جانتے ہیں کہ نفس ناطقہ مدبر بدن ہے،اور اسی کو عقل دی گئی ہے جو آسمانوں کی سیر کرتی اور زمین کے اندر گھستی ہے،مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس ناطقہ کو بھی اس تدبیر میں کوئی دخل نہیں،کیونکہ جب ہم اپنے نفس ناطقہ سے پوچھتے ہیں کہ سنی سنائی ہو چھوڑ کر اپنا ذاتی علم بیان کیجئے کہ غذا کے انقلاب کسی تدبیر سے کئے جاتے ہیں؟ تو وہ صاف کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا،نہ خون بننے کی خبر ہے نہ بلغم وغیرہ کی،بلکہ جانتا تک نہیں کہ جسم میں خون وغیرہ اخلاط بھی ہیں! ہاں وہ جب باہر نکلتے ہیں اور آنکھیں ان کو دیکھ کر مجھے خبر دیتی ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے جسم میں خون وغیرہ اخلاط ہیں اور اسی میں تیار ہوتے ہیں۔مقتضائے عقل تو یہ تھا کہ نفس ناطقہ جو ''عقلمند اور مدبر بدن'' قرار دیا گیا ہے یہ تمام تدبیریں اس سے متعلق ہوتیں مگر خود وہی گواہی دے رہا ہے کہ سوائے باتیں بنانے کے یہ کوئی کام مجھ سے متعلق نہیں۔ جب مدبر بدن کو ان

تدبیروں میں دخل نہیں دیا گیا تو عقل اس کو ہرگز تسلیم نہیں کرسکتی کہ ناواقف محض طبیعت ان اعلیٰ درجے کی تدبیروں کے لئے منتخب کی گئی ہو! اس سے ظاہر ہے کہ یہ سب کام خداے تعالیٰ نے اپنے ہی قبضے میں رکھے ہیں جیسا کہ خود خالق و مدبر عالم فرما رہا ہے یدبر الامر کلہ یعنی ''خدا ہی سب تدبیریں کرتا ہے''۔ اسکو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ مجبور محض ہوکر سب تدبیریں بے شعور و بے وقوف طبیعت کے حوالے کردے۔ اور اگر طبیعت کا وجود تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی یہی کہنا پڑے گا کہ یہ خدا ہی کا کام ہے کہ ایسے بے وقوف سے ایسا انتظامی کام لیتا ہے. یہ غذا سے متعلق ایک اجمالی بحث تھی، پھر دیکھنے سننے میں بھی اقسام کی قدرتیں نمایاں ہیں جن کا حال کسی قدر بسط سے ہم نے ''کتاب العقل'' میں لکھا ہے۔

الغرض درایت اور عقل سے ثابت ہو چکا ہے کہ جتنے کام آدمی کے جسم میں بلکہ تمام عالم میں ہوتے ہیں سب خداے تعالیٰ کی تقدیر اور تدبیر سے ہوتے ہیں، اسی وجہ سے عقلاء ہر کام میں خداے تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں مگر ہر موقعہ کا ذکر جدا ہے، مثلاً جب ان سے کوئی ایسا کام صادر ہوجاتا ہے جو خدا کے حکم کے خلاف ہے تو خداے تعالیٰ کی قہاریت

اور انتقام انکے پیش نظر ہو جاتا ہے اور کمال ندامت سے اس کی معافی کے خواستگار ہوتے ہیں، جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے

وَالَّذِیْنَ اِذَافَعِلُوْا فَاحِشَۃً اَوْظَلِمُوْا اَنْفُسِھِمْ ذَکِرُوْا اللّٰہِ فَاسْتَغْفِرُوْا لِذَنُوْبِھِمْ ’’ اور وہ لوگ جب کر بیٹھیں کچھ کھلا گناہ یا برا کریں اپنے حق میں تو یاد کریں الہ کو اور بخشش اپنے گناہوں کی چاہیں‘‘۔اسی طرح ہر موقعہ کا ذکر جدا ہے اور خاص خاص صفتوں سے خدائے تعالیٰ کو وہ یاد کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی وقت اور کسی کام میں ان کو یاد الٰہی سے غفلت نہیں ہوتی، جیسا کہ حق تعالیٰ ان کے حال کی خبر دیتا ہے **رجال لَا تَھِیْھُمْ تِجَارَۃً وَلَابَیْعُ عَنْ ذِکَر اللّٰہ** یعنی ’’ایسے لوگ جن کو سودا گری اور خرید وفروخت خدا کے ذکر سے غافل نہیں کرنے پاتی‘‘۔دیکھئے تجارت اور خرید وفروخت جو اعلیٰ درجے کے دنیوی کام ہیں ان میں بھی ان حضرات کا ذکر جاری رہتا ہے۔مگر اس ذکر کی حقیقت سرسری نظر سے سمجھ میں نہ آئے گی، تفہیم کی غرض سے چند مثالیں ہم یہاں لکھتے ہیں: مثلاً جن کے پیش نظر اس آیہء شریفہ کا مضمون رہتا ہے یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمْ الْفُقَرَ اءِاِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہِ ھُوَ الْغَنِی الْحَمِیْدَ یعنی ’’اے لوگو! تم اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی غَنَیِ وَحَمِیْدَ ہے‘‘ ان کو جس چیز کی احتیاج ہوتی ہے وہ سمجھتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف احتیاج ہوتی ہے، پھر خدائے تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے **لَیُسَ لِلِاْنسان الا ماسعی** یعنی ''انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی''۔اس لئے تجارت وغیرہ امور میں وہ سعی کرتے ہیں اور اس سعی میں **انتم الفقراء الی اللہ** کا خیال بھی بندھا رہتا ہے، پھر اگر مقصود حاصل ہو گیا تو ان کو اس حاجت روائی میں بڑی خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ ہمارے مالک نے ہم پر یہ فضل اور مہربانی کی کہ ہماری سعی بیکار نہ گئی،اس فضل کی اتنی خوشی ان کو ہوتی ہے کہ اس چیز کے یا زیادہ روپیے کے ملنے سے نہیں ہوتی جو بیع وشریٰ میں مقصود ہوتا ہے،جیسا کہ اس آیت سے مستفاد ہے **قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحو اھو خیر ممایجمعون** ''کہو اللہ کے فضل اور رحمت ہی پر چاہیئے کہ وہ خوشی کریں وہ بہتر ہے اس چیز سے جو وہ جمع کرتے ہیں''۔دیکھئے یہ ذکر کس قدر وسیع اور موثر ہے کہ ابتداء احتیاج سے حاجت روائی تک جاری رہا،اور آخر میں فضل الٰہی کا اس درجہ ممنون بنایا کہ اعلیٰ درجے کے تقرب کا باعث ہے، اور ادھر ظاہری سعی سے حاجت روائی بھی ہوئی اور ''ہم خرما وہم ثواب'' کا مضمون صادق آ گیا، ممکن تھا کہ غفلت کی حالت میں بھی سعی سے کام نکل آتا مگر وہ مرتبہ جو آیہء

شریفہ فاذکرونی اذکرکم یعنی'' مجھے یاد کرو تو میں بھی تمہیں یاد کروں گا'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہاں حاصل ہو سکتا ہے۔

دیکھئے اہل ایمان یوں ترقیاں کرتے ہیں ادھر دنیا بھی حاصل ہوئی اور ادھر ترقی مدارج اخروی بھی ہوتی گئی، حق تعالیٰ فرماتا ہے من کان یرید حرث الاٰخرۃ نزدلہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منہا ومالہ فی الاٰخرۃ من نصیب ''جو کوئی چاہتا ہے آخرت کی کھیتی بڑھائیں ہم اس کی کھیتی، اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اس کو دیتے ہیں ہم کچھ اس میں سے، اور نہیں ہے اس کو آخرت میں کچھ حصہ''۔ جب ان کو روزی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کیونکہ ارشاد ہے فابتغوا عند اللہ الرزق یعنی'' روزی خدا ہی سے مانگو''۔ مگر یہ طلب اکثر اسی طریقہ سے ہوتی ہے جس کا حال ابھی معلوم ہوا وہ جانتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی روزی دینے والا نہیں بحسب مصلحت کسی کو کم دیتا ہے کسی کو زیادہ کما قال اللہ تعالیٰ اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر یعنی'' اللہ جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جسکی چاہتا ہے نپی تلی کر دیتا ہے''۔ غرض کہ ہر حالت میں خواہ افلاس ہو یا تونگری وہ خدائے تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں۔ کسی

ذریعہ سے اگر قدرے قلیل کچھ مل گیا تو خدائے تعالیٰ کی رزّاقیت ان کے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقها ''اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ ہی پر ہے اس کی روزی''، یعنی ہر ایک کو روزی دینے والا وہی ہے، اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ جس اندازہ کا رزق حق تعالے نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ ہمیں مل گیا۔ اور اگر ضرورت سے زیادہ ہو تو یہ خیال کرتے ہیں کہ واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب یعنی ''جس کو چاہتا ہے خدائے تعالیٰ بے حساب رزق دیتا ہے''۔ پھر مال انکے پاس ضرورت سے زیادہ جمع ہو گیا تو یاد کر کے بندگان خدا کا حصہ اس میں سے علحدہ کر دیتے ہیں یعنی زکوٰۃ جس کی تاکید خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں جگہ جگہ کی ہے بطیّب خاطر ادا کرتے ہیں، اور اس کے سوائے دوسرے خیر کے کاموں میں بھی ان کو خرچ کرتے ہیں اس خیال سے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کا نام قرض رکھ کر وعدہ فرمایا ہے کہ ہم یہ قرض اس روز ادا کریں گے جس روز تمہیں اس کی سخت ضرورت ہو گی، پھر لطف خاص یہ ہے کہ قیامت کے وعدہ پر اس قرض دینے کو وہ مقتضائے عقل سمجھتے ہیں۔ جب نماز کا وقت آیا تو خدائے تعالیٰ انہیں یاد گیا کہ اس وقت کی نماز اس نے فرض کی ہے اور فوراً پڑھ

لی، اور رمضان کا مہینہ آتے ہی خدا یاد آ گیا کہ اس مہینے کہ روزے ہم پر فرض کیئے ہیں اور اس کی ادائی میں مشغول ہو گئے۔اور جب موسم حج کا آیا خدا یاد آ گیا کہ ہم پر اس نے حج فرض کیا ہے۔غرض کہ ہر وقت ہر حالت سے متعلق جو کچھ قرآن شریف میں احکام مذکور ہیں ان مواقع میں خدائے تعالیٰ انہیں یاد آ جاتا ہے اور ان احکام کی ادئی بصدق دل کیا کرتے ہیں۔جب کوئی کام ان کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے تو ان کو فوراً یہ خیال آ جاتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ کام کیا، کیونکہ ہمیشہ ان کے پیش نظر ہے کہ کل کاموں کا مدار اسی پر ہے کما قال اللہ تعالی الا الی اللہ تصیر الامور یعنی ''آگاہ رہو کہ خدا ہی سب کام کا مرجع ہے''۔وقولہ تعالیٰ والیہ یرجع الامر کلہ یعنی ''ہر ایک کام کا دارومدار آخر کار اسی پر جا کر ٹھہرتا ہے''۔یعنی جتنے اسباب ہیں بمنزلہ آلات ہیں، اصل کام کرنے والا خدائے تعالیٰ ہی ہے، وہ مختار ہے جو چاہے کرے کما قال اللہ یفعل اللہ مایشاء ویحکم مایرید یعنی ''کرتا ہے اللہ جو چاہتا ہے اور حکم کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے''۔کسی قاعدے وغیرہ سے وہ ایسا مجبور نہیں کہ اس کے خلاف نہ کر سکے۔اگر کوئی کام ان کے مرضی کے مطابق نہ ہوا اور ان کو اس کی ضرورت ہو تو خدا کو پکارتے ہیں اور اپنی عرض حاجت

کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ہے کما قال اللہ تعالی ادعونی استجب لکم ۔ پھر اگر حاجت روائی میں دیر ہوئی تو صبر سے کام لے کر نماز پڑھنے لگتے ہیں جو خاص قسم کی عبادت اور اظہار عبودیت ہے بمقتضائے قولہ تعالیٰ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ یعنی ''مدد طلب کرو صبر اور نماز سے''۔ اور اگر اس کام سے مایوس ہو جاتے ہیں تو خدائے تعالیٰ کے اس ارشاد کو یاد کر لیتے ہیں ویدع الانسان بالشر دعائہ بالخیر و کان الانسان عجولاً یعنی ''آدمی جس طرح اپنی بہتری کی دعا مانگتا ہے اس طرح اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے''۔ اور سمجھ جاتے ہیں کہ وہ کام ہمارے حق میں مضر تھا پھر خدائے تعالےٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ صرف اپنے فضل وکرم سے ہمیں ان آفتوں سے بچایا جو اس کام سے متعلق تھیں۔

جب ان پر کوئی مصیبت آجاتی ہے تو کہتے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون یعنی: ہم تو اسی کے ہیں جس طرح چاہے ہمیں رکھے اور ہم اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مصیبت خدا کے حکم سے آئی ہے کما قال اللہ تعالی ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ یعنی'' جو مصیبت کسی کو پہنچتی ہے وہ اللہ کے حکم سے پہنچتی ہے''۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ہمارے گناہوں کا بھی کس قدر اس میں

لگاؤ ہے جیسا کہ ارشاد ہے وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدکم ویعفو عن کثیر یعنی ”تم پر مصیبت پڑتی ہے تو تمہارے ہی کرتوت سے اور خدا تمہارے بہت سے قصور معاف کرتا ہے“۔ اگر کسی سے کچھ ضرر پہونچ جائے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ سوائے خدائے تعالیٰ کے کوئی نفع اور ضرر نہیں پہونچا سکتا۔

اور اس خیال سے کہ آخر ہم بھی خدا کے قصوروار اور معافی کہ طلب گار ہیں معاف کر دیتے ہیں کما قال للہ تعالیٰ: ولیعفوا ولیصفحو االاتحبون ان یغفر اللہ لکم یعنی ”چاہئے کہ ان کے قصور بخش دیں اور درگزر کریں اور کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کرے“۔ اگر کوئی خطرناک حالت پیش آ گئی تو خدا کو اپنا وکیل کر کے کہتے ہیں کہ ہمیں وہ کافی ہے کما قال اللہ تعالےٰ: الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایماناً وقالو حسبنا اللہ ونعم الوکیل یعنی ”مسلمان وہ لوگ ہیں جن کو لوگوں نے خبر دی کہ مخالفوں نے تمہارے ساتھ لڑنے کے لئے بھیڑ جمع کی ہے تو ان کا ایمان اور زیادہ ہوا اور کہا بس ہے ہم کو اللہ اچھا وہ وکیل اور کارساز ہے“۔ کافروں کو قتل کرتے وقت اس آیت کا مراقبہ رہتا تھا قاتلوھم یعذبھم اللہ

بایدیکم ویخزھم یعنی ’’کافروں کو قتل کرو اللہ تعالیٰ ان پر عذاب کرتا ہے تمہارے ہاتھوں سے اور اُن کو رسوا کرتا ہے‘‘ اسوقت ان کی یہ حالت رہتی تھی کہ گویا عذاب کے فرشتے ہیں جن کو سوائے امتثال امر الٰہی کے کوئی ذاتی غرض نہیں، نہ محبت قرابت جنگ سے مانع، نہ مخالفت مذہبی اس کا باعث۔ تلوار کا جو وار کرتے اس میں بھی یہی خیال کہ خدائے تعالیٰ عذاب اتار رہے ہیں‘ اور اپنے پر جو وار پڑتا اس میں یہ تصور کہ رحمت الٰہی جوش پر ہے اور پیہم مثل باراں نزول کر رہی ہے زبان حال پر ان کے یہ شعر جاری ہے

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

گویا دیکھ رہے ہیں کہ دشمنوں کی تلواروں کہ سایہ کہ تلے جنت ہے اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ اور اسی انتظار میں ہیں کہ اگر پیام اجل آجائے یعنی تیر یا تلوار کا کوئی کاری زخم لگے تو نہایت خوشی سے ’’لبیک‘‘ کہتے ہوئے اپنے محبوب کے پاس ان زندوں کی محفل میں پہونچ جائیں جن کو سعادت ابدی حاصل ہے ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بما آتاھم اللہ

من فضلہ یعنی ''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مرُدے مت سمجھو بلکہ اپنے رب کے پاس وہ زندہ ہیں جن کو رزق دیا جاتا ہے اور خوش ہیں ان نعمتوں سے جو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دی ہیں''۔

ہر بڑھتے قدم کے ساتھ یہ خیال بندھا ہے کہ اپنے محبوب کی طرف بڑھے جارہے ہیں، اور ادھر سے بھی یہ مژدہ سنایا جارہا ہے کہ والسابقون السابقون اولئک المقربون فی جنٰت النعیم ترجمہ: اور آگے نکل جانے والے آگے ہیں سب سے وہ لوگ ہیں مقرب بہشتوں میں نعمت کی''۔ پھر جب کافروں کی لاشوں کو دیکھا تو یہ خیال بھی نہیں کہ ہم نے کچھ کیا بلکہ صاف کہتے ہیں کہ اللہ نے ان کو قتل کیا ہم نے نہیں کیا کما قال اللہ تعالیٰ: فلم تقتلو هم ولکن الله قتلهم یعنی ''تم نے ان کافروں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے کیا''۔ ہر کام میں وہ اپنی مشیت اور اختیار کو خدائے تعالیٰ کی مشیت اور اختیار کے سامنے کاَن لم یکن سمجھتے ہیں کیونکہ حق تعالے فرمایا ہے وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ ''تم نہ چاہو گے مگر جو چاہے اللہ'' یعنی تمہاری مشیت وہی ہوگی جو اللہ کی مشیت ہو۔ وقولہ تعالیٰ: وما کان لهم الخیرة یعنی ''نہیں ہے واسطے ان کے اختیار''۔ اور جو کام ان سے وقوع میں آتا ہے سمجھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ

نے اسے ہم میں پیدا کیا کما قال اللہ تعالیٰ: **واللہ خلقکم وماتعملون** یعنی ''اللہ نے پیدا کیا تم کو اور تمہارے کاموں کو''۔

غرض کہ اہل ایمان خدائے تعالےٰ کو مختلف طریقوں سے ہر حالت میں یاد کرتے رہتے ہیں جس سے ان کے دل میں اطمینان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: **الا بذکر اللہ تطمئن القلوب** ان ہی لوگوں کی شان میں حق تعالیٰ فرماتا ہے

ان فی ذلک لا یات لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعودا وعلیٰ جنوبھم۔

اس تقریر سے ہماری یہ غرض نہیں کہ وہ حضرات **لا الہ الا اللہ** وغیرہ اذکار نہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ باوجود ان اذکار کی کثرت کے ہر کام میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور کوئی کام ان کو یادالٰہی سے مانع نہیں ہوتا تھا۔ یہ خیال غلط ہے کہ یادالٰہی کرنیوالے نکمے اور بیکار ہوجاتے ہیں اور دنیا میں کسی کام کے نہیں رہتے، کیونکہ ان کا یہ مشہور مقولہ ہے

''دست بہ کار و دل بہ یار''۔

یہاں شاید یہ اعتراض کیا جائے گا کہ جب آدمی کوئی کام کرتا ہے تو نفس

ناطقہ اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے دوسرے کام کی طرف توجہ نہیں کرسکتا پھر یہ کیونکر قبول کیا جائے کہ وہ سب کام کرتے تھے اور اس وقت خدا کا ذکر بھی کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی جس کام کی عادت کرتا ہے اس میں سہولت ہو جاتی ہے، اور رشدہ شدہ وہ مثل طبعی کاموں کے ہو جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ نفس ایک وقت میں دو کاموں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، سو یہ مشاہدے کے خلاف ہے، اس لے کہ ہر شخص کو اپنے دوست اور دشمن سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اس وقت خیال کر کے دیکھ لیجئے کہ کتنی چیزوں کی طرف نفس متوجہ رہتا ہے! اول تو بصارت اس کی صورت نفس کے روبرو پیش کرتی ہے، پھر خیال اس کی صورت کو پیش کرتا ہیکہ وہی شخص ہے جس سے پیشتر ملاقات ہوئی تھی اور حافظہ اس کی دشمنی یا دوستی کی صورت کو پیش کرتا ہے، پھر اس نے جو کچھ گفتگو کی اس کا ماحصل جواب کے وقت پیش نظر رہتا ہے، ورنہ جواب کو اس کے ساتھ کچھ تعلق نہ ہوگا جس سے دیوانہ سمجھا جائے گا، پھر باوجود ان تمام امور کے وہ مضمون سونچا جاتا ہے کہ کوئی بات اس میں ایسی نہ ہو کہ قابل مواخذہ ہو، اور اس خیال کے ساتھ ان الفاظ کی تلاش بھی ہو رہی ہے جو مفید مدعا ہوں اور قابل مواخذہ نہ ہوں، اور جہاں تک ہوسکے مشترک ہوں تا کہ گریز کا

موقع مل سکے۔ اس کے ساتھ کبھی سجع وغیرہ محسنات کی بھی تلاش کی جاتی ہے۔ پھر کلام بنانے کی طرف توجہ علحدہ کہ مبتدا خبر وغیرہ قواعد نحویہ ومنطقیہ مناظرہ میں فرق نہ آجائے کیونکہ یہ سب علم فطریہ ہیں ہر شخص کی بول چال میں مخلوط رہتے ہیں، اور اس کیساتھ الفاظ بنانے کا کارخانہ منہ میں جاری رہتا ہے۔ تیس چالیس حرفوں کے مخارج پیش نظر ہیں اور وقتاً فوقتاً عضلات وغیرہ کو موقعہ بہ موقعہ حرکت دے کر زبان اور حلق اور ہونٹوں سے ایک ایک حرف اس طور پر بنایا جاتا ہے کہ حروف مہموسہ، مجہورہ، شدیدہ، متوسطہ، رخوہ، مستعلیہ، مستفسلہ، مطبقہ، منفتحہ، مذلقہ، مصمتہ وغیرہ کی صفات مختصر میں فرق نہ آئے پاتے اور اس کے ساتھ ہوا کے دم کی صرف کی علحدہ توجہ کہ بحسب ضرورت اسی قدر لی جائے جتنی آواز کی بلندی و پستی میں مقصود ہے۔

پھر اگر چلتے وقت باتیں ہو رہی ہیں تو ان عضلات واوتار وغیرہ کی طرف توجہ لگی ہوئی ہے جن سے چال متعلق ہے، پھر اس میں بھی تیز اور آہستہ رفتار کے لئے خاص خاص قسم کی توجہ درکار ہے۔ اور اس کے سواء اور بھی کام ہوتے رہتے ہیں مثلاً دیکھنا سننا وغیرہ جن کے لئے خاص خاص قسم کی توجہ درکار ہے۔ اب غور کیجئے کہ آنِ واحد میں نفس کتنی چیزوں کی

طرف توجہ کیا کرتا ہے پھر اگر ایماندار عقلاء ہر کام میں خدائے تعالیٰ کی طرف توجہ رکھیں تو کونسی تعجب کی بات ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ ہر کس و ناکس کا یہ کام نہیں، البتہ چندروز کی مشاقی سے ہوسکتا ہے، اور جب جس کی عادت ہوگئی تو خاص قسم کا فیضان شروع ہو جاتا ہے جس کا تلذذ جسمانی تلذذ سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے، اسی وجہ سے اکابرِ دین کی توجہ تلذذات جسمانی کی طرف بالکل نہ تھی۔ غرض کہ جب مشاہدہ سے ثابت ہے کہ آدمی عادت کی وجہ سے بہت سارے کام آن واحد میں کرسکتا ہے تو عقل کی رو سے اس میں ذرا بھی شک نہیں ہوسکتا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر کام میں ذکر الٰہی کیا کرتے تھے اور وہی ذکر ان کی کامیابی کا سبب تھا۔ کیونکہ جب ہر کام میں ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی تھی اور بمقتضائے ایمان یہ بات بھی پیش نظر رہتی تھی کہ کوئی کام بغیرامداد الٰہی وجود میں نہیں آسکتا تو بمصداقِ وکان حقا علینا نصر المؤمنین ادھر سے امداد ہوتی تھی جو اصل ذریعہ کامیابی ہے، ورنہ کجا قیصر وکسریٰ کی پرشوکت ہزار وہا سال کی جمی جمائی سلطنتیں اور کجا عرب کے بے سروساماں فقر!! اگر مردم شماری کی نسبت قائم کی جائے تو یہ حضرات ان کا ہزارواں حصہ بھی نہیں، اور اگر آلات اور سامان حرب دیکھا جائے تو کسی قسم کی نسبت نہیں۔

دیکھئے اب بھی وہی ملک عرب موجود ہے، اور وہی عراق، شام، مصر، الجزائر، مراکش، ایران، افغانستان، تونس، ترکستان، بلوچستان وغیرہ موجود ہیں جن کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے فتح کیا ان کے ہر قسم کے حالات پر نظر ڈال کر دیکھ لیجئے کیا عقل اسکو تسلیم کرسکتی ہے کہ ایک چھوٹا سا خطہء عرب جس میں کوسوں بلکہ منزلوں آبادی نہیں اتنے بڑے بڑے آباد اورشاداب ملکوں پر فتح یاب ہوسکتا ہے؟ پھر عرب بھی پورا نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی بنی اسد، غطفان اور کنانہ وغیرہ قبائل نے ایک لاکھ کی جمعیت سے مدینہ منورہ کا محاصرہ کرلیا تھا اور وہاں اہل اسلام کی جمعیت صرف سات آٹھ ہزار تھی جو مقابہ میں ان پر غالب آئی۔ اسی پر اندازہ کرلیجئے کہ خود عرب مخالفین اسلام کتنے تھے۔ پھر ان سلطنتوں میں علاوہ کثرت افواج کے یہ اہتمام بھی ہوتا تھا کہ تمام ملک میں جوش مذہبی اور جذبہء قومی پیدا کرنے کی غرض سے ہر طرف لوگ بھیجے جاتے تھے تاکہ پورا ملک آمادہء جنگ ہوجائے، اور لڑائی کی یہ کیفیت کہ سب سے آگے ہاتھیوں کی فوج رکھی جاتی تھی جو بلاے بے درماں کی طرح اسلامی فوج پر آپڑتے تھے۔ غرض کہ ان تمام واقعات کو جو کتب تواریخ میں مذکور ہیں، پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے تو عقل ہرگز قبول

نہیں کرسکتی کہ عادتی طور پر صحابہ نے ان ملکوں کو فتح کیا ہوگا!! اگر یہاں یہ خیال کیا جائے کہ ان ملکوں میں عرب کے سے شجیع لوگ نہ تھے تو یہ بات قابل تسلیم نہیں، اس لئے کہ جہاں رستم وافراسیاب جیسے افراد پیدا ہوتے ہوں وہاں کے سب لوگ بزدل نہیں ہوسکتے، پھر شجاعان عرب کے ساتھ بھی تو ان حضرت کے مقابلے رہے، بلکہ ابتداء سے مدتوں اس طرح مخالفت رہی کہ پورا ملک عرب ایک طرف اور چند صحابہ ایک طرف، غزوہ بدر میں ایک ہزار جنگ آزمودہ منتخب بہادران عرب مقابل ہوئے جس میں سو سوار تھے، اور کل فوج مسلح، اور اہتمام اس درجہ کا کہ ہر روز نو دس اونٹ ذبح کئے جاتے تھے، اور ادھر صحابہ صرف تین سو تیرہ جن میں صرف تین سوار تھے، اور سامان جنگ کی یہ کیفیت کہ کل چھ زرہیں تھیں اور آٹھ تلواریں، باوجود اس کے ان حضرات نے ستر کافروں کو قتل کیا اور ستر کو گرفتار، اور کل تیرہ صحابہ شہید ہوئے اور بفضلہ تعالیٰ اہل اسلام ہی کی فتح رہی اسی طرح غزوہ احزاب میں دس ہزار جنگجو نبرد آزما ہر قبیلہء عرب کے منتخب افراد نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی، اور صحابہ کل تین ہزار تھے جن کی بے سامانی کی یہ کیفیت کہ بیس روز تک تمام صحابہ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھوں سے خود خندق کھودا کئے، اس کے

بعد پندرہ روز کفار کا محاصرہ اور معرکہ آرائیاں رہیں، اس مدت میں اکثر فاقہ ہوا کیا، یہاں تک کہ ایک بار تو متصل تین روز تک چکھنے کے قابل بھی کوئی چیز نہ ملی، آخر میں ایک روز ایسی ہوا چلی کہ کفار کے لشکر میں تہلکہ مچ گیا اور سب بھاگ گئے، یہ منجانب اللہ تائید باطنی تھی، اگرچہ ہمارے زمانہ کے عقلاء اس واقعہ کو اتفاق پر محمول کرلیں گے مگر ان دس ہزار جنگ جونبرد آزما میں جو عقلاء تھے انہوں نے اس کو اتفاقی امر نہیں سمجھا بلکہ ان کو یقین ہوگیا تھا کہ یہ تائید باطنی منجانب اللہ ہے جس کے مقابلے میں سر بر ہونا محال ہے۔ اسی کو معجزہ کہتے ہیں، جس کے مقابلے سے اتنی بڑی فوج عاجز ہوگئی، ورنہ ہوا کا چلنا کوئی ایسی بات نہیں کہ پرعزم طبائع کو متزلزل کرسکے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب ایک لاکھ کفار نے مدنہ طیبہ کا محاصرہ کیا تو آٹھ ہزار صحابہ نے مقابلہ کرکے ان کو ہزیمت کی۔ ان کے سواء اور بہت سے وقائع ہیں جو کتب سیر وتواریخ سے ثابت ہیں۔

غرض کہ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، ہمیشہ شجاعان عرب صحابہ کے مقابلہ میں ہزیمت ہی پاتے رہے، اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی فتوحات فقط شجاعت یا تدبیروں سے نہیں ہوئیں بلکہ یہ برکت اور تائید اسی ذکر الٰہی کی

تھی جو صحابہ رضی اللہ عنہم ہر موقعہ کی مناسبت سے ہمیشہ کیا کرتے تھے، کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے **یاایھا الذین آمنوا اذالقیتم فئۃ فاثبتوا واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون** ’’اے ایمان والو جب بھڑ و تم کسی فوج سے تو ثابت رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو شاید تم مراد پاؤ‘‘۔اب یہاں اسباب ترقی اسلام پر بھی غور کر لیجئے! عقلاء نے تو بہت سی رائے زنیاں اس بات میں کی ہیں، چنانچہ کوئی کہتا ہے کہ شجاعان عرب کی کوشش تھی، کوئی صنعت اور حرفت و تجارت کو پیش کرتا ہے، کوئی ترقی علوم وفنون بتاتا ہے، مگر ہماری دانست میں کوئی بھی قرین قیاس نہیں، اس لئے کہ شجاعت عرب کا تو حال ابھی دیکھ لیا کہ ایک لاکھ شجاعان عرب کو آٹھ ہزار صحابہ نے ہزیمت دی، اور جس زمانہ میں اسلام ترقی کر رہا تھا جس قدر تجارت وحرفت تھی وہ بھی ملتوی ہوگئی تھی، اس لئے کہ کل اہل اسلام اشاعت دین کی طرف ہمہ تن مشغول تھے۔اور علوم وفنون کا اس وقت یہ حال تھا کہ فیصد ایک یا دو شاید لکھنا پڑھنا جانتے ہوں گے ان چیزوں میں اس وقت ترقی ہوئی جب کہ جانبازان اسلام نے اسلامی کو ترقی دیکر اسلام سلطنت قائم کردی اس میں شک نہیں کہ یہ امور ان سلاطین کی نام آوری کے باعث ہوئے جنہوں نے ان کی طرف توجہ کی، مگر یہاں کلام نفس

اسلام کی ترقی میں ہے۔

اسلام کی ترقی کے اسباب اگر ہم احادیث یا تفاسیر سے بیان کرتے تو بعض حضرات ہماری تقریر کو لغو سمجھتے، اس لئے ہم نے خاص آیات قرآنیہ پیش کیں جن کو ماننے اوران پر عمل کرنے کا وہ اقرار کرتے ہیں، اہل انصاف اورحق طلب عقلاء سے امید ہے کہ ان میں غور وتدبر فرمائیں گے کہ کس وضاحت سے حق تعالیٰ نے ترقی اسلام کی تدبیر بتائی کہ ثابت قدمی کے ساتھ خداے تعالے کا ذکر بکثرت کریں تو یہی امر باعث فلاح ہوگا۔

اتفاقاً اس وقت میری نظر رسالہء ''جواز تصویر'' مولفہ محمد حسین صاحب انجینیر فوٹوگرافر رنگون پر پڑی، انہوں نے جواز تصویر پر **یعملون له مایشاء من محاریب وتماثیل** سے استدلال کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام تصویر بنایا کرتے تھے اور بائیبل سے یہ استدلال کیا کہ شیر اور بیل اورآدمیوں وغیرہ کی تصویریں بنوایا کرتے تھے، پھر وہ آیتیں پیش کیں جن میں کتب سابقہ پر ایمان لانے کی ضرورت ہے، اور یہ بات بتائی کہ ان کتابوں پر ایمان لانے سے یہی غرض ہے کہ تصویریں وغیرہ امور جو ان میں مذکور ہیں سب قابل عمل سمجھے جائیں، اس ضمن میں انہوں نے دل

کھول کر مولویوں کی خبر لی کہ وہ متعصب ہیں، بیہودہ ہیں وغیر ذلک، کیونکہ مسلمانوں کو بائیبل پر ایمان لانے اور عمل کرنے سے روکتے ہیں، اور لکھا ہے کہ: ’’تحقیق قرآن میں کوئی مضمون خلاف عقل وسنت الٰہی (قانون قدرت) کے برعکس مطلق نہیں، مگر آپ نے اور آپ جیسوں نے اپنے مصر خلاف عقل بوڑھیوں کی کہانی جیسی تقریروں تحریروں سے قرآن کی آب وتاب پر اس کی نہایت اعلیٰ اور انتہائی خوبیوں پر، خرق عادت وخرق والتیام کے تروں سے بنی ہوئی ٹاٹ کی بوری ڈال دی ہے، سیدھی سادھی بات کو بھی تعجب انگیز، حیرت خیز بنا دیا ہے‘‘۔

اس تقریر سے اتنا تو ضرور معلوم ہوا کہ مولوی صاحب مذکور کو بائیبلوں سے نہایت دلچسپی ہے، غالباً بائیبلوں میں جتنے قصے ہیں مثلاً انبیاء نے اپنی لڑکیوں کے ساتھ زنا کیا اور خدا کی جوروں نے زنا کروایا، اور رات بھر خدا کے ساتھ کشتی ہوا کی اور بار بار اس کو زمین پر دے مارا (نعوذ باللہ منھا) وغیرہ سب پر ایمان لائے ہوں گے؟! خیر اس سے ہمیں تعلق نہیں مگر اس سے یہ حسن ظن ہوتا ہے کہ جب منسوخ کتابوں پر اعتقاد ہے تو قرآن مجید میں جتنی آیتیں ذکر الٰہی کی ہم نے نقل کی ہیں جو نہایت سیدھی سادھی ہیں، جن پر نہ ٹاٹ کی بوری ڈالی گئی ہے نہ حدیث وتفسیر کا نام لیا گیا ہے

ان پر تو ضرور عمل فرماتے ہوں گے؟! اور جس طرح صحابہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حالت میں ذکر الٰہی کیا کرتے تھے فوٹوگرافر صاحب بھی کیا کرتے ہوں گے؟ خاص کر اس وجہ سے کہ تمام مسلمانوں کو بھی اسی کا حکم ہے جیسا کہ ارشاد ہے واذکروا اللہ کثیراً یعنی ''کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو''۔ اگر ہمارا یہ گمان صحیح ہے کہ فوٹوگرافر صاحب ذکر الٰہی کثرت سے کیا کرتے ہیں تو اس سے کیا بہتر ہے، اور اگر صرف اس غرض سے قرآن اور بائیبل پیش کرتے ہیں کہ کسی طرح مال حاصل ہو، خواہ حلال سے ہو یا حرام سے، تو ہم اس کے قائل نہیں کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلاً اولئک ھم الکافرون حقاً واعتدنا للکافرین عذاباً مھیناً ''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ درمیان میں ایک راستہ نکالیں، تو وہ لوگ یقیناً کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے ذلت کا عذاب تیار رکھا ہے''۔

بیچ کا راستہ یہی ہے کہ قرآن کو اپنی مرضی کے موافق تاویلیں کر کے پیش کریں تاکہ مسلمان سمجھیں کہ قرآن سے استدلال کرتے ہیں، اور دوسرے احکام الٰہیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ شخصی بحث ہے ہمیں ان کے

ذاتی کاموں سے غرض نہیں، مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ کثرت ذکر الٰہی کا باعث فلاح ہونا قرآن شریف سے ثابت ہے اور صحابہ کا کثرت سے ذکر الٰہی کرنا بھی قرآن ہی سے ثابت ہے، تو اب کوئی مسلمان اس میں شک نہیں کرسکتا کہ فلاح اور فیروزی جو صحابہ کو حاصل ہوئی اس کا سبب کثرت ذکر الٰہی تھا اور اسی سے تنزل اہل اسلام کا سبب بھی ضمناً معلوم ہوگیا کہ اس مجرب نسخے کو انہوں نے چھوڑ دیا اور تباہ ہوئے، چنانچہ خود حق تعالیٰ فرماتا ہے یاایھا الذین آمنو الاتلھکم اموالکم ولااولادکم عن ذکر اللہ ومن یفعل ذلک فاولئک ھم الخاسرون ’’اے ایمان والو نہ غافل کریں تم کو تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے اور جو کوئی یہ کام کرے تو وہی لوگ ہیں ٹوٹا پانے والے‘‘ اہل انصاف خود غور کرسکتے ہیں کہ مسلمانوں نے مال اور اولاد کے دھندوں میں پھنس کر ذکر الٰہی کو چھوڑ دیا یا نہیں؟ صحابہ کا سا ذکر تو درکنار اکثر مسلمانوں کی یہ حالت دیکھی جاتی ہے کہ نماز وغیرہ فرائض بھی ادا نہیں کرتے، پھر ان میں سے بہت سے ایسی بھی ہیں کہ نماز و روزہ کی تضحیک کرتے ہیں۔

خسر الدنیا والآخرۃ ہونے کہ لئے صرف ترک ذکر الٰہی کافی تھا، پھر جب اس پر تضحیک وتوہین علاوہ ہو تو کیا حال ہونا چاہیے؟! مال فراہم

کرنا آج کل کچھ ایسا ضروری کام سمجھا جارہا ہے کہ اس کے مقابلے میں دین کوئی چیز نہیں، چنانچہ اس کی رکاوٹیں دفع کرنے کی غرض سے فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہ علوم دینیہ کی بیخ کنی ہو رہی ہے، قرآن کے معنیٰ من مانے گھڑتے جاتے ہیں، اسی کو لیجئے کہ مولوی فوٹو گرافر صاحب نے جب یہ دیکھا کہ شریعت میں تصویر کشی ممنوع ہے جس سے ایک ذریعہ فراہمی مال کا فوت ہوا جاتا ہے تو ایک رسالہ ہی لکھ ڈالا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ بخاری، مسلم، کلینی وغیرہ ہی کے نہ ہو رہیں، وہ قریباً بور کے لڈو ہیں لکھتے ہیں کہ: ''آج کل کے مولوی اور ان کے معتقد کتب الہامیہ کی ضروت نہ محسوس کریں نہ پڑھیں نہ پڑھنے دیں (ہاں پڑھیں گے تو قریباً ڈھول کی رسیوں جھوٹ سچ کی گٹھڑیوں کتاب قصص الانبیا وغیرہ کو) تو وہ ان کا قصور ہے''۔

قصص الانبیاء جو قرآن وحدیث کا ترجمہ ہے وہ تو ڈھول کی رسیاں اور جھوٹ کی گٹھڑیاں ہوئیں، اور کتب محرفہ جن کی تحریف اور اصلاحات کمیٹیوں کی رائے سے علانیہ ہوتی ہیں ان پر ایمان لانے اور عمل کرنے کی ہدایت کی جارہی ہے! پھر استدلال میں ان کتب محرفہ کی عبارتیں پیش کرکے یہ جبر کیا جاتا ہے کہ خواہ مخواہ ان کو تسلیم کرلو، اور کسی نے تامل

کیا تو مغلطات سناتے ہیں، یہ صرف اس غرض سے ہیکہ جائز و ناجائز طریقوں سے مال حاصل کریں اور کوئی کچھ نہ کہے، کیا ان حضرات کو یہ آیتیں نہیں پہنچیں

قل متاع الدنیا قلیل والاٰخرۃ خیر لمن اتقٰی ''کہو فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے اور آخرت کا بہتر ہے پرہیز گار کو''۔ اور قول اللہ تعالیٰ فذرھم یاکلوا ویتمتعوا ویلھھم الامل فسوف یعلمون ''چھوڑ دو انکو، کھالیں اور برت لیں اور امید پر بھولے رہیں کہ آگے معلوم کریں گے''۔ اس کا نام ان حضرات نے قومی ہمدردی رکھا ہے کہ ذرائع معاش کی توسیع مسلمانوں کے لئے کرتے ہیں۔ یہ نہیں خیال کرتے کہ یہ امور باعث غضب الٰہی ہیں جس سے روز بروز اِدبار کی ترقی ہورہی ہے، یہود کے مولوی اسی قسم کے فتوے قوم کو دیا کرتے تھے، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عنداللہ لیشترو ابہ ثمناً قلیلاً فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون ''پس خرابی ہے ان لوگوں کی جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کے یہاں سے اتری ہے، تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑے دام لیں (یعنی دنیاوی فائدے حاصل کریں) پس

خرابی ہے ان کی اس چیز سے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور خرابی ہے ان کی کہ ایسی کمائی کرتے ہیں۔

خدا کا فضل ہے کہ لاکھوں حفاظ قرآن شریف کی حفاظت کررہے ہیں، ورنہ آخری زمانے کے ایسے مولوی مال کی دھن میں لفظی تحریف بھی کرڈالتے، جس طرح معنوی تحریفیں کررہے ہیں۔ دیکھئے یہود کے چند مولویوں نے قوم کی مرضی کے مطابق بطمع دنیوی فتوے دیئے اور تمام قوم پرتباہی آگئی جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباؤا بغضب من اللہ'' اور لگادی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور وہ خدا کے غضب میں آگئے'' حضرات! یاد الٰہی کو چھوڑ کر دنیا میں مشغول ہوجانے سے یہاں تک تو نوبت پہونچ گئی کہ مولوی حالی صاحب پانی پتی ہمیشہ قوم پر مرثیہ پڑھا کرتے ہیں، کیا اب اس بات کا انتظار ہے جو مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں:

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر

مدت سے اسے دور زماں میٹ رہے

حضرات! ذرا تو ایمانی راہ سے غور کیجئے کہ صحابہ کی تعداد بہ نسبت مخالفین کے کسی قطار وشمار میں نہ تھی مگر ان کی روز افزوں ترقیاں ایسی تھیں کہ اگر ان

کے آثار موجود نہ ہوتے تو ہرگز عقل میں نہ آسکتیں، اور اب باوجودیکہ کروڑہا مسلمان ہیں جن کی مالی حالت صحابہ سے لاکھوں نہیں، کروڑوں درجے بڑھی ہوئی ہے، مگر ذلت اور تنزل روز افزوں ہے۔ کیا یہ آثار غضب الٰہی نہیں؟! حق تعالیٰ فرماتا ہے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتٰے یغیروا ما بأنفسھم ''جو نعمت کسی قوم کو خدا کی طرف حاصل ہو، جب تک وہ قوم اپنی ذات سے نہ بدلے خدا اس نعمت میں کسی طرح کا تبدل و تغیر نہیں کیا کرتا''۔ اب صحابہ کی حالت کے ساتھ آخری زمانے کے مسلمانوں کی حالت کو ملا کر دیکھ لیجئے کہ کیسا تغیر انہوں نے کر دیا ہے؟ جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا یہ تنزل ہمارے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ وہاں دنیا کے کاموں میں خدا کا ذکر رہتا تھا یہاں خدا کے ذکر سے بھی دنیا مقصود ہوتی ہے الا ما شاء اللہ۔ وہاں ہر حال میں ذکر الٰہی تھا تو یہاں ہر وقت دنیا کا ذکر وخیال ہے۔ وہاں دین کی اشاعت تھی تو یہاں اس کی بیخ کنی اور اماتت۔ اسی کی سزا یہ ہو رہی ہے کہ وہاں روز افزوں ترقی ہی تو یہاں روز افزوں تنزل ہو رہا ہے۔ اب بھی اہل اسلام اگر قرآن سمجھ کر پڑھیں اور کسی آیت کے معنی اتفاقاً سمجھ میں نہ آئیں تو اس کا علم مفوض الی اللہ کر کے جو باتیں سمجھ میں آتی ہیں بغیر اس کے کہ اپنی رائے سے نئے معنی پیدا کریں، ان پر

ایمان لائیں اور قابل عمل امور پر عمل کریں۔اور جس طرح صحابہ ذکر الٰہی ہر ایک موقعہ کے مناسب کیا کرتے تھے، کیا کریں تو کیا تعجب ہے کہ پھر وہی عزت حاصل ہو جس کی خبر خدائے تعالیٰ نے دی ہے: وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لایعلمون ’’عزت خدا کی ہے اور رسول کی اور مسلمانوں کی، لیکن منافق نہیں جانتے‘‘۔اور تائید غیبی پھر ہونے لگے جس کا وعدہ ہے و کان حقاً علینا نصر المؤمنین یعنی ’’ہم پر حق ہے کہ اہل ایمان کی مدد کریں‘‘۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس زمانے میں ایسے اصول قائم کئے جارہے ہیں کہ ایمان کی نوبت ہی نہ آئے۔اور تاویلیں کر کے قرآن مجید واہی تباہی بنایا جارہا ہے، اور صحابہ جس طرح ایمان لائے تھے جس کی وجہ سے ان کی مدد ہوئی اس پر یہ پردہ ڈالا جارہا ہے کہ کوئی حدیث قابل اعتبار نہیں، پھر جس قوم نے ایمان ہی کو ضرور نہ سمجھا تو خدائے تعالیٰ کو کیا سمجھے گی؟ اور پھر حسب وعدہ اس کی مدد کی کیا ضرورت! بلکہ غیرت الٰہی مقتضی ہو رہی ہیکہ بجائے مدد و یاری کے ذلت ان پر ڈالی جائے۔ پھر ذکر الٰہی جو فلاح اور فیروزی اہل اسلام کا مجرب نسخہ تھا اس کی نسبت اس زمانے کے بعض مولویوں کے خیالات اس درجہ بگڑے ہوئے ہیں کہ گر کوئی اس کا نام لے

لے تو پاگل، ولی، جنتی یعنی احمق، ملاٹا، کٹ ملا، قل اعوذیا وغیرہ بنایا جاتا ہے، جس سے کمزور طبعیت والے مارے شرمندگی کے اس کا نام بھی نہی لے سکتے بلکہ حفظ ماتقدم کے لحاظ سے ان کو اوضاع، اطوار لباس، حرکات، سکنات کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہیکہ کہیں ان القاب میں سے کوئی لقب چسپاں نہ کر دیا جائے۔ حالانکہ اس موقعہ پر ان کو یہ ارشاد الٰہی پیش نظر رکھنا چاہیۓ تھا:

أیبتغون عندھم العزۃ فان العزۃ للہ جمیعاً یعنی ''کیا ان لوگوں کے نزدیک وہ عزت چاہتے ہیں؟ نہ چاہیۓ بلکہ ان کو یہ خیال کرنا چاہیۓ کہ ساری عزت اللہ کے لئے ہے''۔ مسلمانوں کو ان کے خدا کا حکم پہونچانے میں شرم کی کیا ضرورت؟ صاف کہدیں کہ بھائیو خدائے تعالیٰ جس کا تمہیں اقرار ہے قرآن مجید میں جس کو تم بھی خدا کا کلام سمجھتے ہو فرماتا ہے یاایھا الذین آمنوا اذکرو اللہ ذکرا کثیرا وسبحوہ بکرۃ واصیلا یعنی ''اے مسلمانوں کثرت سے اللہ کو یاد کیا کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو''۔ اور ارشاد ہے فاذا قضیتم الصلوٰۃ فاذکرواللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبکم یعنی ''جب تم نماز پوری کر چکو تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے

رہو‘‘۔اورارشاد ہے **فاذاقضیتم الصلوٰۃفانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکرو اللہ کثیرا لعلکم تفلحون** یعنی ’’جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لواور اللہ کے فضل یعنی رزق کی جستجو میں لگ جاؤ اور کثرت سے خدا کی یا دکرتے رہوتا کہ فلاح پاؤ‘‘۔ دیکھئے جہاں روزی یا مال طلب کرنے کا حکم ہے اس کے ساتھ ہی یہ حکم لگا ہوا ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کریں، کیونکہ آدمی کو جب مال زیادہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کو کچھ نہیں سوجھتا، اس لئے تاکید کی گئی کہ کہیں اس حالت میں خدا کو نہ بھول جاؤ بلکہ اگر فلاح چاہتے ہوتو خدا کی یاد کثرت سے کرتے رہو۔اس سے ظاہر ہیکہ مسلمانوں کی فلاح ذکر الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے۔

الحاصل صحابہ کی عقول ودرایت نے تسلیم کرلیا تھا کہ جب حق تعالیٰ نے ہمیشہ ذکر کرنے کو فرمایا ہے تو وہ واجب العمل ہے، اسی طرح کل احکام، اس ایمانی درایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر وہ سب امور آسان ہو گئے اور سب پر عمل کیا، جیسا کہ قرآن شریف اس کی تصدیق فرمارہا ہے۔اسی طرح ان کی درایت ایمانی نے تسلیم کرلیا تھا کہ جن اموراور واقعات کی خبر حق تعالیٰ نے دی ہے وہ واجب التسلیم اور یقینی ہیں جن میں ذرا بھی

شک نہیں ہوسکتا، ہر چند کفار اس تصدیق سے تمسخر و استھزا اور ملامت کرتے تھے مگر ان پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا تھا،

کما قال اللہ تعالیٰ: ولایخافون لومۃ لائم یعنی ''وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہیں''۔

غرض کہ ان کی درایت نے ان سب امور کو ان پر آسان کر دیا تھا، پھر حق تعالیٰ نے ان ہی کی درایت کو پسند کر کے قرآن شریف میں جگہ جگہ ان کی عقلوں کی تعریف کی جس کا حال ابھی معلوم ہوا۔ اس ایمانی درایت کی پیروی سے وہ حضرات دونوں جہاں میں کامیاب اور فائز المرام ہوئے۔ اس عالم کی کامیابی تو اظھر من الشمس ہے اور اس عالم کی کامیابی آیۂ شریفہ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ وغیرہ صدہا آیتوں سے ظاہر ہے، ان کی درایت کی تعریف خود کفار کے اعتراف سے ثابت ہے جس کی خبر خدائے تعالیٰ دیتا ہے وقالوا لوکنا نسمع اونعقل ما کنا فی اصحاب السعیر ''اور دوزخی لوگ فرشتوں سے کہیں گے کہ اگر ہم نے پیغمبروں کے کہے کو سنا یا سمجھا ہوتا تو دوزخیوں میں نہ ہوتے''۔ جب انہوں نے اپنی اور مسلمانوں کی عقلوں کے نتائج دیکھ لئے اسی وقت

اعتراف کیا کہ فی الواقع ہم ہی احمق تھے، اسی لحاظ سے حق تعالیٰ نے ان کوقوم لا یعقلون اور لا یفقھون وغیرہ فرمایا ہےاور مسلمانوں کواولو الابصاراور اولوالالباب وغیرہ خطابوں سے یاد فرمایا۔اصل وجہ ان کی بے عقلی کی یہی ہے کہ اپنی عقلوں سے وہ کام نہیں لیا جو مسلمان لیا کرتے ہیں بلکہ ان کے خلاف میں عقلی دلائل قائم کرتے گئے۔ مسلمانوں کی عقلوں نے جب دیکھا کہ کسی معتبر شخص کی بات گوسمجھ میں نہ آئے مان لی جاتی ہے،تو خدائے تعالیٰ کی بات کیونکر نہ مانی جائے؟ اس لئے جوکچھ قرآن شریف میں ہے اور جوکچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب کو بصدق دل مان لیا، چنانچہ حق تعالیٰ ان کی تعریف میں فرماتا ہے۔ الٓمٓ ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدیً للمتقین الذین یؤمنون بالغیب ۔اورکفار کی عادت تھی کہ جوبات ان کی سمجھ میں نہ آتی عقلی دلائل ایسے قائم کرتے کہ اس کی تکذیب ہوجائے۔

پھر ہر زمانے کے کفار تکذیب آیات قرآنیہ پر نئے نئے دلائل قائم کیا کرتے اور علمائے اسلام ان کے جواب دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ فلسفہ جدیدہ کی نوبت آئی اس نے تو سلام کی مخالفت پر گویا کمر ہی باندھ لی اور دلائل کی وہ بوچھاڑ کی کہ اہل اسلام گھبرا گئے،بعض علمائے نے

دیکھا کہ اس کا جواب مشکل ہے اس لئے بہت سے مسائل میں اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے، چنانچہ سر سید احمد خاں صاحب نے اکثر امور میں اس کی موافقت کی مگر غضب یہ کیا کہ ایک کتاب ہی لکھ ڈالی جس کا نام ''تحریر فی اصول التفسیر'' ہے مقصود اس سے ہے کہ جو بات عقل کے خلاف ہو اس میں تاویل کر کے ہم اسکو عقل کے مطابق کر دیں گے اور بہت سے اصول اس میں قائم کئے جو برہم زن ایمان ہیں اس کتاب سے مسلمانوں کو سخت تکلیف پہنچی کیونکہ ابتدائے اسلام سے آج تک جو عقائد بطور وراثت قرناً بعد قرنٍ اہل اسلام کو پہونچتے آئے سب کو انہوں نے ملیا میٹ کر دیا ، چنانچہ وہ لکھتے ہیں ''جو جاہل ایک بات کو جو عقل انسانی کے مافوق ہے مان سکتا ہے اس وجہ سے کہ فلاں بزرگ نے کہی ہے اور اس کا ایمان مضبوط رہتا ہے کیونکہ اس کے سواء اور کچھ نہیں جانتا، مگر جس کو خدا نے عقل انسانی یا اس کا کوئی حصہ عطا کیا ہے وہ ایسی بات پر مافوق عقل ہے یقین نہیں کر سکتا'' اور لکھتے ہیں قرآن مجید میں کوئی بات مافوق انسانی نہیں ہے مقصود یہ کہ معجزات وغیرہ جو قرآن میں خلاف عقل مذکورہ ہیں ان میں تاویل کر کے ایسے معنی لئے جائیں گے کہ عقل کے مطابق ہو جائیں جس کی خود وہ تصریح کرتے ہیں اور یہی کام تفسیر قرآن میں کر دکھایا۔ اب یہ

دیکھنا چاہئے کہ قرآن میں مافوق عقل انسانی ایسی کونسی باتیں ہیں جن کو عقل تسلیم نہیں کرسکتی ؟اس کا تصفیہ بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ پہلے عقل انسانی کی حد قرار دی جائے جس سے معلوم ہو کہ اس حد سے جو چیز خارج ہے وہ مافوق عقل انسانی ہے ۔اس کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ ان خارجی امور کا گو عقل ادراک نہیں کرسکتی مگر ان کو تسلیم بھی کرسکتی ہے یا نہیں؟ عقلاء اس کو غالباً تسلیم کرلیں گے کہ عقل صرف محسوسات اور وجدانیات تک محدود ہے اس کے آگے وہ چل نہیں سکتی ۔ کیونکہ جب کوئی چیز محسوس نہ ہو اس کے تسلیم کرنے میں عقل اقسام کی دشواریاں اور اشکال پیدا کرتی ہے ۔دیکھئے ابتداء میں جب ٹیلیگرام کا حال سنا گیا کہ چند منٹ میں ہزرار ہا کوس کی خبر اس کے ذریعے سے معلوم ہوتی ہے تو عقل نے اس کو محال سمجھا پھر جب دیکھ لیا تو ساکت ہوگئی گو حقیقت اس کی معلوم نہ ہوئی کہ کن اشیاء سے برق کو حرکت ہوتی ہے اور ان اشیاء کو برق کے ساتھ کیا خصوصیت ہے ۔اسی پر اور امور کا قیاس کرلیجئے کہ دیکھنے سے پہلے محال معلوم ہوتے ہیں ۔ مادرزاد نابینا کی عقل حسن و جمال خط وخال ، غنج ودلال ،نور وظلال ، بدر وہلال ، الوان وتمثال اور نجوم وغیرہ کے احوال کا ادراک ہرگز نہیں کرسکتی ۔اسی طرح مادرزاد بہرے کی عقل آواز کی دنیا کو عدم محض بلکہ محال

سمجھتی ہے۔ان امور سے متعلق ابحاث ہم نے ’’کتاب العقل،، میں بہ تفصیل لکھے ہیں جن سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ عقل انہیں چیزوں کا ادرک کرسکتی ہیں جن کا احساس یا وجدان ہوا ہو،اوراپنے محسوسات اور وجدانیات کے باہروہ قدم نہیں بڑھا سکتی،اسی وجہ سے ان امور میں جواس کی حد سے خارج ہیں جس کا قبول وانکار کوئی قابل اعتبار نہیں اب دیکھئے کہ باجود یکہ عقل اس محدود دائرہ کے بار کام نہیں کرسکتی مگراس سے وہ کا لئے جاتے ہیں جواس کے مقدور سے خارج ہیں اس کا قبول وانکار کوئی قابل اعتبار نہیں۔اب دیکھئے کہ باوجود یہ کہ عقل اس محدود دائرہ کے باہر کام نہیں کرسکتی مگراس سے وہ کام لئے جاتے ہیں جواس کے مقدور سے خارج ہیں،مثلا یہ کام اس کے ذمہ لگایا گیا ہے کہ عالم کس چیز سے بنایا گیا ؟اس کی حقیقت کیا ہے حالانکہ وہ ایک ایسی چیز ہے کہ کسی فرد بشر نے تو کیا زمین وآسمان نے بھی اس کو نہیں دیکھا اس لئے کہ اس وقت سوائے خدائے تعالی کے کوئی موجود نہ تھا مگراس نے برابر اطاعت کی اور یہ بھی نہ کہا کہ حضرت میں کہاں اور مادۂ عالم کہاں اس وقت آپ کے جدامجد کا بھی وجود نہ تھا۔اس میں شک نہیں کہ اس ٹکا پوئی سے کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ اس مسئلے میں ہر ایک حکیم کی عقل نے وہ خبر دی جو دوسرے کے مخالف تھی

جیسا کہ حکماء کے اقوال سے ظاہر ہے مگر اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ عقل کسی بات میں رکتی نہیں، پھر کیا وجہ کہ قرآن میں جو امور مافوق عقل ہیں اور ان میں رد کی جاتی ہیں بمناسبت مقام چند حکماء (فلاسفر) کے اقوال مسئلہ مادہ سے متعلق یہاں نقل کئے جاتے ہیں جو حدائق النجوم اور تاریخ فلاسفہ یونان میں مذکور ہیں۔طائیس ملیطی اور فیثا غورث وغیرہ قدمائے فلاسفہ کی عقلوں نے کہا کہ ان ہی عناصر اربعہ سے ایک عنصر مادہ عالم ہے مگر اس میں چار فرقے ہوگئے بعضوں نے کہا وہ پانی ہے گاڑھا ہوکر خاک بنا اور پتلا ہوکر ہوا ہوا اور اس سے زیادہ لطیف ہوکر آتش بنا اور اس کے دھوویں سے آسمان اور کواکب وغیرہ بنے دوسرے فرقے نے کہا کہ وہ خاک ہے لطافت اس میں بتدرج بڑھتی گئی اور آب وہوا اور آتش وجود ہوا اور ان سے باقی اجسام بنے تیسرے فرقے نے کہا کہ وہ ہوا ہے اور کثیف ہوکر آب وخاک بنی اور اس کے دھویں سے افلاک بنے، چوتھے فرقے نے کہا کہ وہ آتش ہے کہ اس میں کثافت بڑھتی گئی اور باقی عناصر پیدا ہوئے اور اس کے دھویں سے افلاک بنے ایک جماعت کمون وبروز (خفا وظہور) کی قائل ہوئی ان کی عقلوں نے کہا کہ مادہ عام خلیط ہے یعنی ہر جنس کے غیر متناہی چھوٹے چھوٹے اجزاء خلا میں پھرتے رہتے ہیں متشا

یہ اجزاء باہم مل کر ایک ایک قسم کا جسم بنتا ہے۔ فیلسوف عقل نے کہا کہ گھانس کے اجزا میں گوشت ہڈی وغیرہ اشیاء موجود ہیں اسی وجہ سے جانور جب گھانس کھاتا ہے تو ہر چیز اپنے مناسب اجزاء کو کھینچ لیتی ہے اشرا قین کی عقلوں نے کہا کہ جسم طبعی بسیط ہے اور کسی چیز سے مرکب نہیں اور جسم فقط صورت جسمیہ کا نام ہے۔ مَشّائین یعنی ارسطو اور اس کے توابع کی عقلوں نے کہا کہ ہر جسم دو چیز سے مرکب ہے ایک ہیولیٰ دوسرے صورت ہیولیٰ یعنی مادہ جو ہر ہے مگر وہ نہ متصل ہے اور نہ منفصل نہ اس قابل ہے کہ اس کی طرف اشارہ حسیہ کر سکیں۔ حکیم دیمقراطیس کی عقل نے کہا اور اہل حکمتِ جدیدہ کی عقلوں نے بھی اسکی تصدیق کی کہ مادہ عالم چھوٹے چھوٹے اجزائے ریشہ ہیں جو مل کر ایک ایک چیز بنتے ہیں اور تراکیب کے لحاظ سے ان میں قوتیں اور حواس اور افعال وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

اسحاق نیوٹن صاحب کہتے ہیں کہ وہ اجزاء ٹوٹ پھوٹ نہیں سکتے ہر ذرہ جس طرح ازل میں تھا اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا، ہر جسم کی بقاء کا دارومدار ان ہی اجزاء کی ترکیب پر ہے۔ ان اجزاء کی ترکیب میں فرق آتے ہی وہ چیز معدوم ہو جاتی ہے۔

ابیقور فلسوف کی عقل نے کہا کہ ''وہ ذرات مدتوں سے متفرق حرکت

کرتے رہے، پھر اتفاقاً جمع ہوتے گئے اور ایک ایک جسم بنتا گیا، اور اب بھی وہ ہمیشہ حرکت کرتے رہتے ہیں اسی وجہ سے بڑے جسم چھوٹے، اور چھوٹے بڑے، اور موجود و معدوم ہوتے رہتے ہیں۔ پھر جن کا اتصال خواہ آفتاب کے نزدیک ہونے سے یا اور کسی سبب سے زائل ہو جائے گا تو یہ عالم فنا ہو جائے گا اور پھر دوسرے عالم کی ابتداء ہوگی. اور اس کا قول ہے کہ ''پیشتر آدمی اور درندے وغیرہ حیوانات زمین سے پیدا ہورے تھے جیسے کیڑے پیدا ہوتے ہیں، مگر زمین اب بانجھ ہوگئی، جس زمانہ میں آدمی زمین سے پیدا ہوتے تھے ان کے جسم پر خنزیروں کے سے سخت بال ہوتے تھے اس وجہ سے لباس کی انہیں ضرورت نہ تھی اور جنگلوں میں بسر کرتے تھے مگر جب خنازیر اور درندوں سے جھگڑے ہونے لگے تو تمدن کی بنیاد ڈالی۔ پیشتر صرف آفتاب کی گرمی سے کوئی چیز پکا لیتے تھے، ایک بار آسمان سے بجلی گری اور کسی چیز کو جلایا جن لوگوں کو آگ کی منفعت معلوم ہو چکی تھی انہوں نے اس کی حفاظت کی''۔

ادنی تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ یہ سب اٹکل پچو کی خیالی باتیں ہیں جن پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔ اور ظاہر ہے کہ مادہ عالم عقل انسانی کی حدود سے باہر ہے کہ کیونکہ کسی انسان نے نہ اس کو دیکھا نہ دیکھ

سکتا ہے، باجود اس کے کچھ نہ کچھ ادراک اس کا کرہی لیا، پھر احیائے اموات وغیرہ خوارق عادات کے ادارک سے عقل کو کون چیز مانع ہے خصوصا ایسی حالت میں کہ خود خدائے تعالی نے اس کی خبر دی ہے بخلاف مسئلہ مادہ کے کہ وہاں تو سوائے تخمین اور اٹکل کے کوئی دستاویز اور سہارا ہی نہیں۔ حکمت جدیدہ میں مسلّم ہو چکا ہے کہ آفتاب زمین کو کھینچتا ہے اور زمین آفتاب کے گرد پھرتی ہے اور قوت تارک المرکز سے ہر وقت وہ دائرہ سے باہر نکلنا چاہتی ہے مگر قوت تارک المرکز اس کی اتنی بڑھی ہوئی ہیکہ آفتاب کو جو اس سے ساڑھے نو کروڑ میل سے بھی زیادہ دور ہے اس زور سے کھینچتی ہے کہ قوت تارک المرکز کا اس پر کوئی اثر نہیں ہونے پاتا، یہ قوت اس کی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ باجودیکہ آفتاب کا مادہ زمین کے مادے سے تین لاکھ تئیس ہزار نو سو اٹھائیس حصہ زیادہ ہے مگر اس چھوٹی سی زمین نے اس کو اس زور سے کھیچا کہ اپنی جگہ اس نے چھوڑ دی اور لگا چکر کھانے تا کہ قوت تارک المرکز کی مدد سے اپنے آپ کو اس کی کشش سے بچالے آگر آفتاب اپنی گردش سے دائرہ بنالیتا جو اس کے لئے مستحکم حصار کا کام دے رہا ہے تو زمین اس کی اس طرح کھینچ لیتی کہ سنبھل نہ سکتا۔ اب اس طاقت کا اندازہ کیئے کہ آفتاب زمین سے تین لاکھ تئیس ہزار چند سے بھی زیادہ

وزن دار ہے اس کو زمین نے اپنی طرف کھینچ کر گردش میں ڈالدیا اور وہ بھی کتنی دور پر؟ سو نہیں، ہزار نہیں لاکھ نہیں، ساڑھے نو کروڑ میل پر۔ باجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ مکھیاں بلکہ مچھر بلا تکلف مخلّیٰ بالطبع ہر طرف اڑتے پھرتے ہیں اور زمین کی مجال نہیں کہ جس طرح آفتاب کو گردش میں ڈالدیا ان پر اتنا زور چلائے!! حالانکہ وہی مکھی جب مرجاتی ہے تو اس کو ہوا میں سے فوراً کھینچ لیتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مکھی بلکہ مچھر کی ذاتی طاقت زمین کی کششی طاقت سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوئی ہے!! اس موقعہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ مکھی کی حرکت ارادی ہے اور زمین کی کشش طبعی اور حرکت ارادی کشش طبعی پر غالب ہوا کرتی ہے۔ مگر عقل کی راہ سے اس کی کوئی وجہ ثابت نہیں ہوسکتی، اس لئے مکھی کے جسم کے ساتھ یہاں دو کششیں متعلق ہوئیں ایک کشش زمین جو ہر جسم کو خواہ جاندار ہو یا بے جان وہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے دوسری مکھی کی کشش جو اپنے جسم کو کھینچ کر زمین سے الگ کر کے اوپر کی جانب لے جاتی ہے، اگر مقابلہ ہے تو ان دو کششوں کا ہے ارادہ کو اس میں کوئی دخل نہیں کیونکہ وہ ایک جداگانہ کیفیت ہے جس طرح کشش کے ساتھ متعلق ہوتا ہے ترک کشش کے ساتھ بھی متعلق ہوتا ہے چنانچہ مکھی اپنے ارادہ سے زمین پر اتر آتی ہے جس سے ظاہر ہے کہ ارادہ کو

قوت کششی میں کوئی دخل نہیں ،اسی وجہ سے جس مقدار کی قوت کسی چیز میں ہوتی ہے ارادہ سے وہ زیادہ کہ نہیں ہوسکتی ،اب مکھی کی مقدار قوت کششی اور زمین کے مقدار قوت کششی کا موازنہ کر لیجئے کہ دونوں میں کیا نسبت ہے اگر مکھی کی قوت کے برابر بھی زمین کی قوت کشش ہوتی تو مچھر نہ اڑسکتا۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آدمی اپنی حرکت ارادی سے جب ایک دو ہاتھ اوپر کی جانب کودتا ہے تو اس کو نیچے لانے والی کون چیز ہے اصول حکمت جدیدہ پر ثقل طبعی تو کوئی چیز ہی نہیں کہنا پڑے گا کشش زمین اس کو نیچے لاتی ہے۔اب ہم پوچھتے ہیں کہ حرکت ارادی کے وقت تو کشش زمین بیکار ہوجاتی ہے اور مچھر کو بھی نہیں کھینچ سکتی تو انسان کو اس نے کس طرح کھینچا ؟اگر کہا جائے کہ حرکت ارادی کہ فنا ہونے کے بعد کھینچتی ہے تو ہم کہیں گے کہ اس کو فنا کرنے والی کونسی چیز ہے؟ جب وہ اپنے ارادے سے اوپر جارہا تھا تو اس کا ارادہ نیچے آنے کا نہ تھا بلکہ اس مجبوری سے نیچے آیا کہ اس کا جسم ایک حد تک جا کر رک گیا اور اس کا سبب وہی کشش زمین ہے جو آناً فاناً اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے یہاں تک کہ اس کی حرکت ارادی پر غالب آجاتی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ وہ عین حرکت ارادی کے زمانے میں بھی حرکت ارادی کے ساتھ مقاومت کرتی ہے اس

صورت میں یہ کہنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ حرکت ارادی کے وقت کشش زمین بے کار رہتی ہے پھر جب عین حرکت ارادی کے وقت زمین کی قوت کشش مکھی اور مچھر کے جسم کو کھینچتی ہے اور کشش بھی کس قوت کی کہ ساڑھے نو کروڑ میل پر یہ اثر کیا کہ آفتاب جیسے عظیم الجثہ کے قدم اکھاڑ دیئے تو دو چار ہاتھ کے فاصلہ پر سے مچھر کو نہ کھینچ سکنا کس قسم کی بات ہے!! ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آدمی پتھر کو زمین سے اٹھا کر اوپر کی جانب پھینک دیتا ہے اور وہ برابر اوپر کی جانب چلا جاتا ہے حالانکہ پتھر کی وہ حرکت ارادی نہیں !! اب کہئے کہ اس وقت زمین کی وہ کشش کہاں گئی جس سے آفتاب کو کھینچ رہی تھی؟ اگر کہا جائے کہ پتھر کی حرکت قسری میں انسان کی حرکت ارادی کا اثر ہے جس سے کشش زمین مغلوب ہوجاتی ہے، تو ہم کہیں گے کہ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے ارادہ کا اثر ایسا قوی ہے کہ زمین کی قوت کشش اس کے مقابلہ میں بالکل مغلوب اور بے کار ہوجاتی ہے اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ اگر بڑا پتھر ہو یا بجلی وغیرہ اسباب مادیہ کے باعث پہاڑ سے لڑھکے اور زمین اس کو اپنی طرف کھینچے تو چاہئے کہ آدمی اپنی قوت ارادیہ سے جہاں چاہے روک دے کیونکہ ثقل طبعی تو کوئی چیز نہیں جس کا دباؤ انسان پر پڑ سکے، رہی زمین کی قوت کشش سو وہ انسان کی قوت ارادی

کے مقابلہ میں دم نہیں مار سکتی پھر کیا وجہ کہ وہ پتھر انسان کی قوت ارادی سے نہیں رک سکتا۔غرض کہ کشش زمین کا مسئلہ جس کی بناء پر آسمانوں کا انکار کیا جاتا ہے ایسا بے بنیاد ہے کہ کوئی معمولی عقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتی ۔باجوداس کے ہمارے اکثر معاصرین کا اس پر پورا پورا ایمان ہے اگر اس قسم کی باتیں قرآن شریف میں ہوتیں تو یہی حضرات اس پر قہقہے اڑاتے یا خوش اعتقادی سے تاویلیں کرتے۔کیا یہ باتیں عقل میں آسکتی ہیں ؟یا قرآن میں ایک بھی ایسی بات کوئی بتلاسکتا ہے؟ یا یہ کہہ سکتا ہیکہ خالق عالم کا کسی مردے کو زندہ کرنا یا کسی کو بغیر باپ کے پیدا کرنا ایسا ہے جیسے مچھر کم طاقت چیز یعنی زمین کروڑہا میل سے آفتاب کو کھینچتی ہے۔اب کہیے کہ حکیموں کی ایسی باتوں پر ایمان لانا اور خدائے تعالی جو اپنی قدرت کاملہ کی خبر دیتا ہے اس کی تصدیق اس وجہ سے نہ کرنا کہ وہ خلاف عقل ہے کس قسم کی بات۔غرض کہ حکمت جدیدہ کی اس قسم کی مخالف عقل باتوں کو جب عقل نے مان لیا تو مسلمانوں کی عقل خلاف عادت امور کو اس وجہ سے مان لے کہ خالق عزوجل نے خبر دی تو اعتراض کی کیا وجہ؟ بلکہ نہ ماننے کی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ قرآن کو کلام الہیٰ نہ سمجھا۔اہل حکمت جدیدہ نے دیکھا کہ کسی تاریک مکان میں باریک سوارخ کی راہ سے روشنی کسی

چیز پر منعکس ہو تو اس چیز کی شبیہ دیوار پر الٹی بنتی ہے اس پر یہ حکم لگایا کہ آنکھ میں جو صورت جاتی ہے وہ شبکیہ پر الٹی سرنگوں مرئی کی شکل بنتی ہے اور مدرک جوان کے نزدیک دماغ (یعنی بھیجہ) ہے اس کو الٹی دیکھتا ہے اور سیدھی سمجھتا ہے اس وجہ سے کہ بچے اسکو ہاتھ لگاتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ یہ میز یا کرسی مثلاً سیدھی ہے اور اس امر کی بہت دن تک عادت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ان تصویروں سے سیدھے جسم کا تصور ہوتا ہے۔ یہ بحث ہم نے کتاب العقل میں کسی قدر تفصیل سے لکھی ہے وہاں دیکھ لی جائے۔ حکماء نے اب تک جس کو نہایت قابل وثوق بنا رکھا تھا اور کہا کرتے تھے کہ رجس ہرگز غلطی نہیں کر سکتی مگر اس دور میں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ رجس ہی غلطی کیا کرتی ہے کبھی صحیح طور پر کسی چیز کو بتلا ہی نہیں سکتی اگر ہزار کوشش کی جائے اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جائے جس طرح ہم الٹا دیکھتے ہیں وہ محسوس بھی ہو جائے مگر نہیں ہوتا اور وجدان بھی گواہی دیتا رہتا ہے کہ جس طرح ہم خیال کرتے ہیں کہ شکل سیدھی ہے اسی طرح دیکھتے بھی ہیں۔ ایسا نہیں کہ احول کی طرح خیالی صورت ایک ہے اور محسوس دو ہیں۔ اب غور کیجئے کہ عقل کیسی بھولی بھالی چیز ہے کہ خلاف بداہت اور خلاف وجدان حکم کرنے میں بھی تامل نہ کیا اور اس عقلی

بات پر ایمان لانے والوں کی عقلیں کس درجہ بھولی ہیں کہ ایسی بات کو مان لیا جس کو کسی کی عقل قبول نہیں کرتی اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہیکہ عقل قصداً مخالف بنائی جاتی ہے کہ فلاں قسم کی بات اگر خدا بھی کہے تو نہ مانی جائے ۔دراصل عقل ایک آلہ ہے مثل تلوار کے جس سے دشمن کو بھی قتل کرتے ہیں اور خودکشی بھی کرسکتے ہیں ۔اسی طرح عقل سے ایمان کو مستحکم بھی کرسکتے ہیں اور اسکی بیخ کنی بھی کرسکتے ہیں تو اس میں عقل کا کوئی قصور نہیں ۔حکمت جدیدہ میں بیان کیا گیا ہے کہ زمین ایک ساعت میں اڑسٹھ ہزار دوسوسترہ میل مسافت طے کرتی ہے ،حالانکہ اس کا مشاہدہ ممکن نہیں پھر جب ایسی غیر محسوس ما فوق العقل چیز کو حکمائے یورپ کی تخمین وقیاس پر مان لیا تو خدائے تعالی نے جو خبر دی ہے کہ سلیمان علیہ السلام ہر روز تخمین ایک ہزار میل بذریعہ ہوا طے کرے تھے اس لے مان لینے میں عقل کو کیا تامل ؟ دونوں میں فرق ہے تو اس قدر ہے کہ دن بھر میں ایک ہزار میل مسافت طے کرنے کی خبر اللہ تعالی نے دی ہے اور اڑسٹھ ہزار میل سے مسافت طے کرنے کی خبر اہل یورپ نے دی ہے اب غور کیجئے کہ حکیموں کی قیاسی خبر سے ۱۶ لاکھ ۳۷ ہزار سے زیادہ مسافت روزانہ طے کرنے کو مان لینا اور خدا نے جو صرف ایک ہزار میل روزانہ طے کرنیک کی خبر دی

ہے اس کو غلط قرار دینا کیا ایمان دار کا مقتضیٰ ہوسکتا ہے؟ حق تعالیٰ نے تخت بلقیس کی جو خبر دی ہے کہ چند روز کی مسافت ایک لمحے میں طے کر کے سلیمان علیہ السلام کے پاس آ گیا تھا اس کو بھی عقل مان سکتی ہے کیونکہ جب اس نے زمین کی ایسی حرکت کو مان لیا کہ نہ اس پر کسی کا دباؤ ہے کہ کوئی محرک تو خدائے تعالی کے حکم سے تخت کا حرکت کر کے آجانا کونسی مشکل بات ہے بشرطیکہ اس کو باور کرایا جائے کہ خدا ایسی زبردست قدرت والا ہے کہ معدوم شئے کو وجود میں لایا کرتا ہے اور اگر خدا ہی پر ایمان نہ ہو تو البتہ عقل اس قسم کی بات کو نہیں مان سکتی۔ حکمت جدیدہ میں ثابت ہے کہ زمین ہر سال ایک بار انیس کروڑ میل ثوابت کے نزدیک ہو جاتی ہے اور پھر چھ مہینے کے بعد ۱۹ کروڑ میل ان سے دور ہو جاتی ہے اور اس قرب و بعد کے زمانے میں ستاروں کی مقدار جسامت میں فرق محسوس نہیں ہوتا چنانچہ قطب تارے کو ہم ہمیشہ ایک ہی حالت پر دیکھتے ہیں۔ یوں تو یہ کہ دینا آسان ہے کے ان ستاروں کا قطر ۱۹ کروڑ بلکہ انیس ارب میل سے بھی زیادہ کہہ مگر اس کا ثبوت حواس سے ہوسکتا ہے نہ دلیل سے۔ رہا یہ کہ دوربینوں سے ثابت کیا جائے گا سو وہ ممکن نہیں اس لئے کہ ان کا اتنا ہی کام ہے کہ مقدار محسوس سے ہزار حصے یا اس سے زیادہ

دکھلائیں اصلی مقدار دکھانا ان کا کام نہیں ۔ غرض کہ نہ حرکت زمین محسوس ہے کہ قرب و بعد نہ اس کے آثار صرف آسمانوں کے ابطال کی غرض سے تمام امور فرض کیئے جارہے ہیں اور مقلدوں کی عقلیں ان پر ایمان لا رہی ہے پھر خدائے تعالی کے قول پر ایمان لانے میں اسے کیا تامل؟! زمین کی کشش یہاں تک عام کردی گئی ہیکہ جو چیز نیچے کے جانب جھکتی ہے کہا جاتا ہے کہ اسکا سبب کشش زمین ہے یعنے وزن و ثقل کوئی چیز نہیں ۔حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کرہ جس کا قطر مثلاً ایک ہاتھ کا ہو اس کو پارہ سے بھر کر ایک ہاتھ میں لیں اور دوسرا اتنا ہی بڑا ربر کا گولا دوسرے ہاتھ میں لیں تو باجودیکہ خطوط کششی دونوں پر برابر پڑیں گے پارہ کا کرہ ضرور بھاری محسوس ہوگا جس سے ظاہر ہے کہ کشش زمین کو ثقل میں کوئی دخل نہیں پھر دباؤ ہر ایک کا ہتھیلی پر محسوس ہوگا اور باجودیکہ کشش کا احساس لامسہ سے ہوتا ہے مگر پشت دست کی طرف کشش بالکل محسوس نہ ہوگی !!اس سے بھی ظاہر ہے کہ کشش سے ان دونوں کروں کے دباؤ میں کچھ دخل نہیں ۔باوجود ان تمام بدیہی قرائن ثقل کے عقل ،حکمت جدیدہ کے لحاظ سے محسوسات کو نظر انداز کردیتی ہے ۔تو ایسی سلیم الطبع چیز کو اگر اخبار قرآنیہ کی نسبت یہ باور کرایا جائے کہ اللہ تعالی نے یہ خبریں دی ہیں تو ممکن نہیں کہ

ان کا انکار کرے۔امور مذکور اور دوسرے صدہا نظائر سے جو کتب حکمت میں مذکور ہیں یہ بات ثابت ہے کہ عقل اپنی حد سے باہر غیر محسوس چیزوں کا بھی ادارک کیا کرتی ہے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط،اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہیکہ قرآن میں کوئی خبر ایسی نہیں جو مافوق عقل انسانی ہو جس کو عقل قبول نہ کر سکے ، کیونکہ نظائر مذکورہ سے ثابت ہے کہ عقل انسانی ان سے زیادہ مستبعد چیزوں کا ادرک کیا کرتی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ کسی معتمد علیہ کہ قول کا اسکو سہارا ملے ۔پھر جب حکماء کے متخالف اور متعارض اقوال کا سہارا اس کے لئے کافی ہے،تو خدائے تعالی کے قول سے بڑھ کر معتمد علیہ اور کون چیز مل سکتی ہے !!۔اس سے ثابت ہے کہ عقل انسانی کی فطرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے معتمد علیہ کے قول کو بلا دلیل مان لے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نئی روشنی کے طلبہ امور مذکورہ بالا کی تصدیق برابر کرتے ہیں،اور اگر ان سے دلائل پوچھے جائیں تو فیصد شاید بھی پانچ بھی ایسے نہ نکلیں گے جو دلائل قائم کر کے اپنے مقابل کو ساکت کر سکیں ،مگر چونکہ حکماء پر ان کو اعتماد اور اعتقاد ہے اس لئے ان کے کل اقوال کو گو کیسے ہی خلاف عقل کیوں نہ ہوں تسلیم کر لیتے ہیں کیونکہ معتمد علیہ کے قول کو مان لینا مقتضائے فطرت انسانی ہے۔اسی وجہ سے مصلحت الٰہی مقتضی ہوئی کہ ہر نبی کو ایسے خوراق

عادات و معجزات عنایت ہوں کہ اس قسم کے کام اس وقت کا کوئی فرد بشر نہ کر سکتا ہو، جن کے دیکھنے سے عقلاء اور اہل انصاف سمجھ جائیں کہ یہ امور جن کا ظہور بغیر تائید الٰہی کے ممکن نہیں حق تعالی نے ان کی نبوت کی نشانی قرار دیکر انکو عنایت کئے ہیں، پھر جب وہ معتمد علیہ بن گئے تو جس قسم کے احکام و اخبار خدا کی طرف سے پہنچائیں گے خواہ معاد سے متعلق ہوں یا معاش سے اور معمولی عقلوں کے مطابق ہوں یا مخالف بمقتضائے فطرت انسانی سب کو وہ قبول کرلیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہر نبی نے جب معجزات دکھلائے تو لاکھوں غیر متعصب عقلاء نے ان کو نبی تسلیم کرلیا اور ان کی ہر بات کی تصدیق کی ہر چند صداقت حسن خلق، اور اصلاح تمدن وغیرہ بھی ممتاز بنانے والے امور ہیں مگر ان میں آدمی کے کسب کو دخل ہے، ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے نفس پر تکلیف گوارا کر کے اپنے آپ کو صادق اور خوش خلق ثابت کر دے اور تمدن کے عمدہ طریقے ایجاد کرے جس طرح اکثر حکماء نے کیا تھا، اس لئے ان امور سے عقلاً ہر گز ثابت نہیں ہوسکتا کہ ایسا آدمی بنی ہوکر من جانب اللہ آیا ہو جس پر ما ینطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحی صادق آئے، بخلاف خوارق عادات کے وہ من جانب اللہ مامور ہونے پر یقینی دلالت کرتے ہیں، کیونکہ جب انبیاء علیہم السلام یہ دعوے

کرتے تھے کہ خدائے تعالی نے خلق اللہ کی ہدایت کے لئے ہمیں بھیجا ہے اوراس کی دلیل یہ ہے کہ جوامور قدرت بشری سے خارج ہیں بحکم الٰہی ہم کو دکھاتے ہیں تو ان خوارق کے دیکھنے کے بعد ان کے صدق کا انہیں یقین ہو جاتا اور ان کی کل باتوں کو مان لیتے تھے ۔قرآن شریف سے ثابت ہے کہ جب کبھی خدائے تعالی نے کسی قوم میں رسول بھیجا اس کے ساتھ کوئی نشانی ایسی دی جو برہان کا کام دیتی تھی اور جولوگ باجوداس کے بھی ایمان نہ لاتے تو ان پرعذاب نازل ہوتا جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ذلک بانھم کانت تاتیھم رسلھم بالبینت فلکفروا فاخذھم اللہ انہ قوی شدید العقاب یعنی ’’ان لوگوں نے کھلی کھلی نشانیاں دکھلائیں پھر جب انہوں نے نہ مانا تو اللہ نے ان کو پکڑا اور اللہ قوی اور شدید العقاب ہے‘‘ ۔اب دیکھئے جن نشانیوں کے قبول نہ کرنے پرسخت مواخذہ ہو وہ کیسی کھلی نشانیاں خوراق عادات ہونی چاہییں ؟حق تعالی نے موسی اور ہارون علیھما السلام کوفرعون کی طرف جب بھیجا تو فرمایا کہ ہماری نشانیاں ساتھ لے جاؤ جیسا کہ ارشاد ہے اذھب انت واخوک بایاتیچنانچہ انہوں نے جاتے ہی فرعون سے کہا کہ ہم خدا کی طرف سے تیرے پاس آئے ہیں اور اس کی نشانیاں بھی ہمارے ساتھ موجود ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے قد

جئنٹک بایۃ من ربک یعنی ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانیاں لائے ہیں، اور دوسری آیتوں سے ثابت ہے کہ نو نشانیاں موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھیں کما قال تعالیٰ ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات بینات یعنی ’’ہم نے نو نشانیاں روشن موسیٰ علیہ السلام کو دی تھیں‘‘۔انہیں نشانیوں کو دیکھکر ہزار ہا جادوگر وغیرہ مسلمان ہوئے جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے اور کل انبیاء کی نشاینان ویسی ہی ہوتی تھیں چناچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے فلما جائتھم اٰیاتنا مبصرۃ قالوا ھذا سحر مبین وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلما وعلوا یعنی ’’جب ان کے پاس ہماری نشانیاں آنکھیں کھولنے والی آئیں یعنی معجزات کو ان لوگوں نے دیکھ لیا تو لگے کہنے یہ تو صریح جادو ہے اور باوجودیکہ ان کے دل یقین کر چکے تھے مگر انہوں نے ظلم اور شیخی سے ان کو نہ مانا‘‘۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ کفار معجزات دیکھنے پر بھی نبیوں کی تصدیق نہیں کرتے تھے مگر ان کو یقین ہوجاتا تھا کہ وہ من جانب اللہ ہیں ،اور ظاہر ہے کہ جب تک وہ نشانیاں قوت بشری سے خارج نہ ہوں کبھی اس قسم کا یقین نہیں ہوسکتا۔ان آیتوں سے ثابت ہے کہ لفظ ’’آیت‘‘ جس طرح قرآن شریف کی آیتوں کو کہا جاتا ہے معجزات کو بھی کہا جاتا

ہے، دراصل قرآن شریف کی آیت کو جو ''آیت'' کہا جاتا ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے ک وہ معجزہ ہے، اس لئے کہ تمام فصحائے عرب سے کئی بار کہا گیا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات سے قرآن بنالیتے ہیں تو تم بھی آخر فصیح اہل لسان ہو ایک آدھ سورت ایسی بنالاؤ! مگر ان سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ سورہ انا اعطینا کے برابر کوئی عبارت بنالائیں، اس سے ظاہر ہے کہ ایک سطر کی مقدار بھی کلام الٰہی معجزہ ہے۔

غرض کہ حق تعالیٰ نے ہر رسول کو مبعوث کرنے کے وقت اس کا لحاظ ضرور رکھا کہ کوئی نہ کوئی نشان ان کے ساتھ ہو جس کی وجہ سے لوگوں کو یقین ہوجائے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ فطرت انسانی کا مقتضیٰ ہے کہ ایسے موقعہ میں وہ نشانی طلب کرتا ہے۔دیکھئے اگر کوئی شخص کسی ملک میں جا کر دعویٰ کرے کہ مجھے بادشاہ نے اپنا نائب مقرر کرکے تمہاری طرف بھیجا ہے اور میری اطاعت تم پر لازم ہے تو عقلاء اس سے یہ ضرور پوچھیں گے کہ آپ کے پاس کوئی نشانی بھی ہے جس سے معلوم ہو کہ بادشاہ نے آپ کو ہمارا حاکم بنایا ہے؟ اگر وہ ان کے جواب میں کہے کہ نشانی یہ ہے کہ میں قانون ایسا بناتا ہوں کہ اسے کوئی توڑ نہ سکے، کیا کوئی عاقل اس کو باور کرے گا؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ لوگ بھی کہیں گے کہ

حضرت قانون تو بعد بنتا رہے گا پہلے آپ ایسی نشانی دکھایئے جس سے ہمیں یقین ہو کہ آپ بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہیں، بلکہ وہ بغیر نشانی کے اس کو اپنا حاکم بنالیں تو موردِ عتابِ شاہی ہوں گے۔

اب مرزا حیرت صاحب کی تقریر پر غور کیجئے جو مقدمہء تفسیر الفرقان میں لکھتے ہیں ''یہ نہ معجزہ ہے کہ خشک درخت میں میوہ لگ جائے، گھوڑا آسمان پر اڑنے لگے، یہ باتیں مجنونانہ خیالات ہیں''اور لکھتے ہیں کہ'' یہ معجزہ نہیں کہ بھان متی کے سوانگ دکھائے جائیں بلکہ معجزہ سے جو غرض ہے وہ یہ ہے کہ نبی ایسے قوانین بنائیے جو قیامت تک بلا تبدیل رہیں چنانچہ مسلمان باوجود آزادی کے نماز، روزہ، حج، زکاۃ وغیرہ اب تک ادا کرتے ہیں اس کا نام معجزہ ہے''۔فی الواقع مرزا صاحب نے نہایت لطیف بات کہی کہ صدیاں گزرنے پر بھی دینی احکام میں اب تک فرق نہ آیا یہ ایک حیرت انگیز بات ہے جس کو معجزہ کہنا چاہئے،مگر معجزہ صرف اسی میں منحصر ہو تو یہ لازم آئے گا کہ معجزہ کا ظہور آخری زمانے میں ہوا، حالانکہ ضرورت اس وقت تھی جب آپ نے دعویٰ کیا تھا کہ مجھے حق تعالیٰ نے تمام آدمیوں کی ہدات کہ لئے بھیجا ہے جس پر انہوں نے باقتضائے فطرت انسانی طلب کی تھی، اگر اس وقت حضرت رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ میرے پاس نشانی یہ ہے کہ میں ایسا قانون بناتا ہوں کہ تیرہ سو برس تک بلکہ قیامت تک نہ ٹوٹے، تو کیا کوئی عاقل اس کونشانی سمجھتا یا یہ کہتا کہ حضرت نشانی تو اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں، اگر تیرہ سو برس کے بعد آپ کا معجزاور نشانی ظاہر ہوگی تو وہ ان پر حجت ہوگی جو اس زمانہ میں موجود ہوں گے ہم پر اس کا اثر کیوں ڈالا جاتا ہے؟ بخلاف اس کے شق قمر وغیرہ خوارق عادات جو قدرت بشری سے خارج ہیں جب دکھلا دیے گئے تو پھر تصدیق کرنے میں کوئی عذر نہ رہا۔ اس وجہ سے ایک لاکھ سے زیادہ اہل انصاف بصدق دل مشرف باسلام ہوئے اور وہی لوگ محروم رہے جن کو تعصب مذہبی اور عناد وغیرہ نے روک رکھا۔ مرزا صاحب جو معجزوں کو ''بھان متی کا سوانگ'' بتاتے ہیں سو یہ کچھ ان ہی پر منحصر نہیں کل کفار معجزوں کو سحر کہا کرتے تھے چنانچہ حق تعالے اس کی خبر دیتا ہے فلما جاء تھم آیاتنا مبصرۃ قالوا ھذ اسحر مبین یعنی ''کفار کھلی نشانیاں دیکھنے پر کہتے کہ یہ صریح جادو ہے'' مگر دل بھی عجیب چیز ہے اس میں انصاف کا ایک مادہ ضرور رکھا ہے، اسی وجہ سے کفار گو عناد و تعصب کی راہ سے معجزوں کو سحر کہتے مگر ان کا دل تسلیم کر لیتا تھا کہ یہ خوارق عادات یقیناً خدا تعالی کی طرف سے ہیں ممکن نہں کہ آدمی اپنی قدرت سے یہ کام کر سکے، چنانچہ حق تعالی

ان کے دل کا یہ حال بیان فرماتا ہے وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم ظلم وعلوا یعنی ان کے دلوں نے تو یقین کرلیا تھا کہ یہ قدرت کی نشانیاں ہیں مگر ظلم اور تکبر کی راہ سے انہوں نے اس کا انکار کیا۔ پھر مرزا صاحب مقدمہ مذکورہ میں لکھتے ہیں کہ آج دنیا میں ایسے معجزے کا پتہ نہیں لگتا جو خلاف فطرت باری تعالی کسی زمانے میں ظہور پذیر ہوا ہو اور کچھ نہ کچھ اس کا اثر باقی ہو، مثلاً کسی نبی نے کسی پہاڑ سے چشمہ بہا دیا مگر آج جا کر دیکھو تو وہاں نہ چشمہ ہے نہ تری، اگر ان باتوں کو فرض کرلیں یہ صحیح ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ معجزے کے دکھلانے سے فائدہ ہی کیا ہے؟ اگر ایک شخص نے سوکھے درخت میں میوے لگا دئے اور وہ کھلا بھی دئے تو اخلاقی اثر ان پھلوں کا کھانے والوں پر کیا ہوا؟ انسانی تمدن میں کیا ترقی ہوئی؟''

چشمہ کا ذکر مرزا صاحب نے جو کیا ہے وہ قرآن شریف کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے قولہ تعالی **و اذا استسقی موسی لقومہ فقلنا اضرب بعصاک الحجر فانفجرت منه اثنتا عشرة عینا قد علم کل اناس مشربھم** ''اور جب موسی نے اپنی قوم کے لئے پانی کی درخواست کی تو ہم نے فرمایا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، لاٹھی کا مارنا تھا کہ پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور سب لوگوں نے اپنا گھاٹ معلوم کر

لیا‘‘۔مرزا صاحب کہتے ہیں کہ یہ جھوٹی خبر ہے، کیونکہ اگر صحیح ہوتی تو وہ چشمہ اس وقت موجود ہوتا! اور اگر فرضی طور پر اس کو مان بھی لیں تو ایک خرابی ضرور لازم آتی ہے۔

مرزا صاحب کی جرات قابل دید ہے کہ کس ڈھٹائی سے خدائے تعالے کا مقابلہ کرر ہے ہیں! جب ان کو خدا کا خوف نہیں تو مسلمانوں کا کیا خوف ؟اور مسلمانوں کی بھی عجیب حالت ہے کہ جب انہوں نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی تکذیب کی تو ہر طرف سے لعن طعن کی بو چھاڑ ہوگئی اور خدا اور رسول اور قرآن کی تکذیب پر کسی کو جنبش تک نہ ہوئی!!

مرزا صاحب نے جو یہ جملہ کہا اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے نشانی کے معنی اور مقصود پر غور نہیں کیا ورنہ کبھی ایسی بات نہ کہتے ،اسی کو دیکھ لیتے کہ جب نیا حاکم کسی ملک پر جاتا ہے تو مہری اور دستخطی پروانہ بادشاہ کا طلب کیا جاتا ہے، اس سے مقصود صرف اسی قدر ہوتا ہے کہ بادشاہ کی خاص نشانی دیکھ کر وہ حاکم تسلیم کرلیا جائے ،اسی وجہ سے خدائے تعالی نے موسی علیہ السلام کے عصا وغیرہ کو نشانی فرمایا جس سے ان کی نبوت مسلم ہو گئی اور اہل انصاف ان پر ایمان بھی لائے اور مخالفوں پر حجت قائم ہوگئی چنانچہ اسی کی پاداش میں وہ غرق کردئے گئے ، جب اس نشانی سے مقصود

حاصل ہو گیا تو پھر اس کا باقی رہنا کیا ضروری؟ دیکھ لیجئے جب کسی مقدمہ میں گواہوں کی شہادت پر قاضی فیصلہ کر دیتا ہے تو پھر اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ جب تک مدعی اور اس کے ورثہ اس جائداد پر قابض رہیں جس کا استحقاق ان کی شہادت سے ہوا تھا گواہ بھی زندہ رہیں، اب رہا اخلاقی اثر سو وہ نبی کی ہدایتوں سے متعلق ہے اس میں نشانی کو کیا دخل۔ اس کے بعد مرزا صاحب اسی کتاب میں لکھتے ہیں: ''خالق کائنات کا یہ قاعدہ ہے کہ ہر صدی میں وہ اپنی مخلوق میں سے ایک عبد کو اس لئے چن لیتا ہے کہ جو غلط خیالات بعض خارجی محسوسات اور باطلہ اوہام کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح اپنے ہی قوانین قدرت کے مطابق کرائے، اس صدی میں اس نے خاص اس عاجز کو چنا ہے اور وہ خود مدد کرتا ہے چونکہ اس عاجز کے کام میں برابر اس کی مرضی شامل ہے اور عاجز کے ساتھ اس کا ہاتھ کام کر رہا ہے اس لئے خود بخود معارف کھلنے لگے ورنہ اس عاجز نے کبھی مولوی کے آگے زانوے شاگردی یہ کیا نہ صرف ونحو فلسفہ منطق وغیرہ پڑھا پھر جب آنکھیں بند کر لیں تو ظاہری علوم اور باطنی معارف کے کل عقدے حل ہوتے چلے جاتے ہیں اور قلم برداشتہ لکھتا چلا جاتا ہے اور اجزاء کے اجزاء بلا تکلف لکھ ڈالے''۔ اس کے بعد لکھتے

ہیں کہ: ”اس بیان سے معجزہ اور نبوت کا کچھ نہ کچھ مفہوم ناظرین کے سمجھ میں آ گیا ہوگا اور اسے جان لیا ہوگا کہ نبوت وہ نبوت نہیں جسے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے نہ معجزہ کا وہ مقصود ہے جو عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، تاہم ابھی بہت کچھ باقی ہے“۔!! بمصداق العاقل تکفیہ الاشارۃ ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ مرزا صاحب کو بھی نبوت کا دعوی ہے اور معجزہ یہ ہے کہ کرزن اخبار اور کتابوں کے جز کے جز لکھ ڈالتے ہیں اور چونکہ کسی نبی نے نہ اتنی کتابیں لکھیں نہ اخبار، اس لئے جب لوگوں نے انبیاء سمجھ رکھا ہے نہ وہ انبیاء تھے نہ ان کو نبوت حاصل تھی، اور قرآن میں جو انبیاء کے معجزات اور خوارق عادات بیان کئے گئے ہیں وہ ”بھان متی کے سوانگ“ تھے ان کو نبوت سے کوئی تعلق نہیں۔ اب جس کا جی چاہے قرآن شریف کی تصدیق کر کے انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا قائل ہو اور حضرت محمد مصطفے ﷺ کی امت میں رہے اور جس کا جی چاہے مرزا صاحب اور ان کے ہم مشرب نبیوں کی امت میں داخل ہو جائے! حق تعالی فرماتا ہے وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر انا اعتدنا لظالمین نارا احاط بھم سرادقھا وان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل یشوی الوجوہ بئس الشراب وسائت مرتفقا ” کہو اے محمد ﷺ کہ حق یعنی قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پس جو

چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر ہو جائے، مگر منکروں کے لئے ہم نے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جیسے پگھلا ہوا تانبا وہ مونہوں کو بھون ڈالے گا، برا پانی ہے اور بری آرام کی جگہ ہے''۔ مرزا صاحب معجزوں اور خوارق عادات کو مانیں یا نہ مانیں مگر صحابہ سے لے کر آج تک کے تقریبا کل اہل ایمان جن کی پیروی ہم پر لازم ہے ان کو مانتے ہیں۔ یہ بات بھی معلوم کرنے کے قابل ہے کہ خوارق عادات میں ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ عادت الٰہی جاری ہے کہ اس عالم اسباب میں ہر کام کو اسباب ہی سے متعلق فرماتا ہے اس وجہ سے ظاہر بینوں کی نظر اسباب ہی میں محدود اور محصور رہتی ہے یہاں تک کہ دہریوں وغیرہ نے تو خدا ہی کا انکار کر دیا اور کہا کہ سب کام زمانہ ہی چلاتا ہے چنانچہ حق تعالی ان کے قول کی خبر دیتا ہے وما یھلکنا الا الدھر اور مادیین کل امور مادہ سے متعلق کرتے ہیں جیسا کہ اہل حکمت جدیدہ کا اعتقاد ابھی معلوم ہوا ان کے نزدیک عالم کے تمام کاروبار اجزائے رشیہ اور ذرات پر چل رہے ہیں کہ بحسب اتفاق ایک ایک قسم کے جسم بنتے جاتے ہیں اور ان کے متفرق ہونے سے عالم فنا ہو جائے گا، اور بحسب اتفاق پھر جس

طرح وہ نئی بنیاد ڈالیں گے دوسرا عالم ظاہر ہوگا۔جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ذرات سب کچھ کر لیتے ہیں خدا کی کوئی ضرورت نہیں اور چونکہ خدا کے تسلیم کرنے میں نفس پر دشواریاں واقع ہوتی ہیں اس لئے یہ تقریر ایسی سریع الاثر ہے کہ بہت جلد لوگ اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔غرض کہ خوارق عادات سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی متعلق ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عالم کو پیدا کرنے والا بھی کوئی ہے جس کے حکم سے ایسے امور ظہور میں آتے ہیں کہ نہ کبھی زمانے کی آنکھوں نے ان کو دیکھا نہ مادہ میں ان کی صلاحیت و استعداد ہے۔الحاصل معجزات جس طرح نبوت انبیاء علیہم السلام کی سند ہیں،توحید الٰہی کے فرمان بھی ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ اقتدار الٰہی میں کسی کو دخل نہیں اور جس کو چاہتا ہے وہ معزول کر دیتا ہے۔

اس تقریر سے اس قول کی حقیقت بھی کھل گئی جو کہا جاتا ہے کہ نبی کا کام نہیں کہ خدائے تعالیٰ نے جو ہر کام کے لئے قانون فطرت تیار کر رکھا ہے اس کو ملیا میٹ کر دے،اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہرگز منظور نہ تھا کہ قانون فطرت میں دست اندازی کریں، بلکہ جب انہوں نے قانون فطرت کا حال یہ دیکھا کہ قانون بنانے والے کو کوئی جانتا تک نہیں تو بحکم الٰہی اس قانون میں کسی قدر تغیر و تبدل کر دیا، اس کی مثال ایسی سمجھنی

چاہئے کہ کوئی بادشاہ قانون بنائے کہ فلاں کام فلاں شخص سے متعلق رہے اور فلاں کام فلاں شخص سے اور ہر ایک اپنے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں مصروف ہو جائے لیکن ایک مدت کے بعد لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ فلاں قسم کے کام مثلاً گورنر سے متعلق ہیں وہ حاکم مختار ہے جو چاہتا ہے کر سکتا ہے سر براہ ملک کو اس کے اقتدارات میں کوئی دخل نہیں یا سر براہ ملک کو معطل الوجود سمجھ لیں یا یہ خیال کرلیں کہ سوائے وئ گورنر کے اس ملک کا کوئی بڑا ہے ہی نہیں تو کیا ایسی صورت میں سر براہ مملکت کا یہ خیال مطابق عقل ہو گا کہ قانون مقررہ کے خلاف کوئی حکم نافذ کرنا خلاف وعدہ اور خلاف شان ہے !۔ اگر اس خیال کا کوئی بادشاہ ہو اور باوجود قدرت کے قانون پروری کرے تو عقلا پاگل سمجھا جائے گا اس وقت مطابق عقل یہی ہو گا کہ بلا لحاظ قانون اس گورنر کو موقوف کر دے۔ ہر نبی کے زمانہ میں جب آسمانی سلطنت قائم ہوئی کی اس وقت کا مقتضی یہی تھا کہ اسباب جو مستقل حکمران سمجھے جاتے ہیں معزول کر دئے جائیں تا کہ لوگوں کے خیال درست ہو جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ اسباب کوئی مستقل حاکم نہیں بلکہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں وہی عالم کا مستقل بادشاہ ہے اور مختار ہے جس کو چاہے موقوف کر دے کوئی مانع نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ انبیاء علیہم

السلام نے خود مختاری سے کوئی کام نہیں کیا بلکہ بحسب مرضی الٰہی تھوڑی دیر کے لئے اپنے معجزات سے اسباب کو معزول کروا کے عادات پرستوں پر یہ ثابت کر دیا کہ سوائے خدائے تعالیٰ کے اس عالم کا مستقل بادشاہ اور مالک الملک کوئی نہیں۔ الحاصل رسالت قائم ہوتے وقت معجزات کی ہر طرح سے سخت ضرورت تھی ورنہ ممکن نہیں کہ ایک شخص تن تنہا سارے جہاں کی مخالفت کرے اور پھر کامیاب بھی ہو، اور مخالفت بھی کیسی کہ ان کے دین کو جھوٹا بتائے اور ان کے معبودوں کی سخت توہین کرے اور ان کو اوران کے آبا واجداد کو گمراہ ثابت کرے اور ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالے جس کی باتیں ان کی عقل کے سراسر مخالف ہوں، مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد تمام اگلے۔ پچھلے لوگ بحکم خالق زندہ ہوں گے اور ہم کو اور ہماری باتوں کو نہ ماننے والے ابدالآباد دہکتی آگ میں ڈالے جائیں گے، اور سانپ اور بچھو وغیرہ اس آگ میں ان پر عذاب کے لئے مسلط ہوں گے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ جوش مذہبی آدمی کو اس حد تک پہنچا دیتا ہے کہ کیسا ہی رذیل اور بزدل شخص ہو اس کو بھی اپنی جان تک کی پرواہ نہیں ہوتی، چھوٹی چھوٹی قوموں کے جوش مذہبی نے بڑی بڑی سلطنتوں کو درہم برہم کر دیا۔

اب غور کیجئے کہ نبی ﷺ نے عرب میں اور عرب کے بھی اس قبیلے میں

جس کے افراد کی شجاعت علو ہمت غیرت تمام عرب سے بڑھی ہوئی تھی یعنی قریش میں نئے دین کی بنیاد ڈالی، اور ان کے پرانے دین اور معبودوں کو صراحتاً جھوٹے کہا اور صاف کہہ دیا کہ میں ان کا ابطال کرنے کو آیا ہوں! دیکھئے دعویٰ ایسا کہ ہر شخص کی اشتعالک طبع کا موجب اور تعصب مذہبی کی آگ بھڑکانے والا یہود جیسے افلاس زدہ وذلیل لوگ جن کی شان میں ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وارد ہے جب کسی نبی سے اس قسم کا دعویٰ سنتے تو برداشت نہ کرسکتے چنانچہ اکثر انبیاء کو انہوں نے قتل کر ڈال کما قال اللہ تعالٰی فلم تقتلون انبیاء اللہ ان کنتم مؤمنین۔ اور قوم ایسی کہ سوائے مارنے مرنے کے استاد نے ان کو کوئی دوسرا سبق پڑھایا ہی نہیں، اور جہالت ان کی اس بلا کی کہ اگر کسی نے اپنے قبیلے کی ہجو کی تو اس کے قبیلے کے پیچھے پڑ گئے اور اگر کوئی کسی کی بکری کو مار دے تو اس قبیلے کا آدمی جہاں مل گیا مارا گیا، فخر ہے تو اس بات پر کہ ہم نے اتنے آدمی کمال بے رحمی سے مار ڈالے اور عار اس غضب کا کہ اپنی لڑکی کو ناز ونعمت سے پرورش کر کے اس وقت زندہ دفن کر دیتے جب شادی کے لائق ہو جاتی، صرف اس خیال سے کہ وہ لڑکی دوسرے کے گھر جائے گی، اسی عار نے ان کو صحرا نشین خانہ بدوش رکھا کہ کیوں ہم کسی کی نوکری کر کے اپنی حریت پر

فرمانبرداری کا دھبہ لگالیں۔ پھر آپ حضرت ﷺ کوئی مالدار وذی شوکت نہ تھے، سب جانتے تھے کہ یتیم ہیں، اور اگران میں عقلمند بھی تھے تو ان کی محفل میں معقول باتوں کی قدر اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی جو ائینہ کی قدر محفل کوراں میں ہو سکے، خود حق تعالٰی ان کے حال کی خبر دیتا ہے لھم قلوب لایفقھون بھا ولھم اعین لایبصرون بھا ولھم آذان لایسمعون بھا اولائک کالانعام بل ھم اضل واولٰئک ھم الغافلون یعنی ان کے دل تو ہیں مگر ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کے آنکھیں بھی ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کے کان بھی ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے ، وہ لوگ چار پایوں کے مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور یہی لوگ غافل ہیں۔ پھر آپ نے کوئی ایسی تدبیر بھی نہیں کی جیسے عقلاء کیا کرتے ہیں کہ جس قوم کے مقتدا بنا چاہتے ہیں ایک مدت تک اس کے مسلّمات پر زور دیتے رہتے ہیں اور جو امور اپنے مقصود کے مانع ہوں ان کو اقسام کی تدبیروں سے بتدریج اٹھاتے جاتے ہیں اور اس عرصہ میں چند عقلاء کو اپنے ہم خیال بھی بنالیتے ہیں پھر اس وقت اپنے دعویٰ کا اظہار کرتے ہیں جیسا کہ مرزا صاحب قادیانی نے کیا کہ پہلے براہین احمدیہ لکھی جس میں مسلمانوں کی طرف سے مخالفوں کا مقابلہ کیا اور الہام کا وجود ثابت کرکے

اپنے چند الہام لکھ دئے مگر ذو جہتین کہ مواخذہ ہو تو گریز کی راہ مل سکے، اور اس عرصہ میں چند مولویوں کو ہموار کر کے ایک مدت کے بعد عیسویت کا دعویٰ کیا اور ان ہی الہاموں سے کام لیا جو بطور تمہید براہین احمدیہ میں لکھے تھے۔ اسی طرح کل مفتریوں کا حال رہا، بخلاف اس کے نبی کریم ﷺ نے نہ کبھی مداہنت کی نہ کوئی تدبیر بلکہ ابتداء سے انتہاء تک آپ کا ایک ہی دعویٰ رہا کہ کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تصدیق کرو۔

اب غور کیا جائے کہ جو شخص ایسی جنگجو خونخوار کثیر التعداد قوم کا مقابلہ کر کے چاہے کہ ان کے دین و آئین کو ملیا میٹ کر دے اور ان کے مقابلے میں ان کے اور ان کے آبا و اجداد کو جانوروں سے بدتر ثابت کرے اور ان کے معبودوں کی توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے اور ہر وقت خود ان کے قابو میں ہو اور وہ اس تاک میں رہیں کہ کسی طرح اس کو قتل کر ڈالیں جیسا کہ قرآن شریف سے ظاہر ہے **واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک** تو کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضرت ان سے اپنے آپ کو کسی حیلہ سے بچا سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اب معجزوں کا انکار کرنے والوں سے پوچھا جائے کہ ان تمام امور پر غور کر کے انصاف سے بتائیں کہ اس قوم کے مقابلے

میں آں حضرت ﷺ کی کامیابی معجزہ نہیں تو کیا ہے؟! ہم نے مانا کہ ابو طالب آپ کے حامی تھے مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ کل قوم ایک طرف اور وہ بوڑھے شخص ایک طرف! پھر وہ بھی مدت العمر آں حضرت ﷺ کے اس دعوے کے مخالف ہی رہے اور ان کا ایمان ایک آدھ روایت سے ثابت بھی ہے تو دم واپسین کے وقت۔ اور سرداران قریش کی مخالفت یہاں تک تھی کہ تمام ملک عرب کے بڑے بڑے قبیلوں کے ہزارہا سپاہیوں کو لے کر حضرت ﷺ پر چڑھائی کی اور حضرت تیرہ سال مکہ معظّمہ میں رہے اور وہ دیکھتے تھے کہ ایک ایک دو دو شخص ایمان لاتے جاتے ہیں اور مجمع بڑھتا جاتا ہے، پھر یہ بھی نہیں کہ وہ عزلت گزیں ہوں بلکہ عین مجمع کے وقت جب کہ کفار عبادت کی غرض سے حرم کعبہ میں جمع ہوتے یہ حضرات روزانہ وہاں جا کر علی رؤس الاشہاد ان کی مخالفت کرتے، یہاں تک کہ باہم مار پیٹ بھی ہو جاتی مگر ان سے یہ نہ ہو سکا کہ اپنے جوش غضب کو ٹھنڈا کریں۔ اگر قریش کو ابو طالب کی رعایت تھی تو یہ بھی ممکن تھا کہ در باطن دوسرے قبیلے والوں کو اقدام قتل پر آمادہ کر دیتے اور بہت ہوتا تو خونبہا دے کر بڑے میاں کو راضی کر لیتے جیسا کہ عرب کا عام دستور تھا، اور وہ بھی اس خیال سے چپ ہو جاتے کہ مخالفت کا اندیشہ فرو ہو گیا۔ یہ

سب ایسی تدبیریں ہیں کہ فطرت ان کو تسلیم کرتی تھی مگر خالق عزوجل کے مقابلے میں کیا ہوسکتا تھا وہاں تو **واللہ یعصمک من الناس** کا ازلی وعدہ پورا کر کے ایک ایسا معجزہ دکھانا منظور تھا جس کو ہر زمانے کے اہل انصاف تسلیم کرلیں۔ احادیث میں مختلف واقعات مذکورہ ہیں کہ جب وہ لوگ آپ کے قتل کا ارادہ کرتے تو ایسے غیبی اسباب مثلاً شیر وغیرہ نمودار ہوجاتے ہیں کہ سوائے گریز کے ان کو گزیر نہ ہوتا ،اگرچہ ہمارے معاصرین اس قسم کی روایتوں کونہیں مانتے مگر جب ایسا عظیم الشان معجزہ ثابت ہوگیا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدتوں اس خون خوار جانی دشمن قوم میں رہے اور وہ کچھ نہ کرسکے تو عقل ان غیبی تدابیر سے ہرگز انکارنہیں کرسکتی۔ ہمارے معاصرین نے جو پختہ عزم کر رکھا ہے کہ اس قسم کی باتیں کبھی نہ مانیں گے سو یہ کوئی نئی بات نہیں،اس طبیعت والے ہر زمانہ میں ہوا کرتے ہیں چنانچہ اس زمانے میں ایسے بھی لوگ تھے کہ ہزارہا معجزے دیکھنے پر بھی ایمان نہ لائے ایسی طبعیت والوں کو سمجھانے کی ہمیں بھی ضرورت نہیں اس لئے کہ حق تعالی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم کی ہے کہ ذرھم یاکلوا ویتمتعوا ویلھھم الامل فسوف یعلمون یعنی ’’چھوڑ وان کو کہ کھائیں اور دنیا کے فوائد حاصل کریں اور امیدیں ان کو غفلت میں ڈالیں عنقریب

ان کو حال معلوم ہو جائے گا ‘‘۔اس موقعہ میں ہم صرف اہل انصاف کو توجہ دلاتے ہیں کہ پہلے اس پر غور فرمائیے کہ تواتر کیسی چیز ہے اور وہ مفید علم ویقین ہے کہ نہیں ،اس کے بعد یہ بھی دیکھیں کہ معجزات کے باب میں جو احادیث وارد ہیں وہ حد تواتر کو پہنچی ہیں یا نہیں؟ پہلے یہ بات معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آدمی میں علم اور یقین اعلیٰ درجے کی کیفیت رکھی گئی ہے ،اوراس کے کل کمالات اسی سے وابستہ ہیں۔ دیکھئے اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کو کسی بات کا یقین ہوتا ہی نہیں تو نہ اس کو یہ یقین ہوگا کہ میں آدمی ہوں اور نہ یہ کہ کھانا پانی وغیرہ ضروری اور نافع چیزیں ہیں اور نہ یہ کہ آدمی جانوروں سے ممتاز اور قابل علم ہے پھر ایسے شخص کو آدمی سمجھنے کی کیا ضرورت ۔عرض کہ آدمی میں منجملہ اور کمالات فطریہ کہ ’’یقین‘‘ ایک ایسا کمال ہے کہ تمام کمالات دنیوی اور دینی اسی سے متعلق ہیں،اس یقین کے حاصل کرنے کے لئے حق تعالی نے پانچ حواس عطا کئے ہیں جن سے آدمی کام لے تو وہ کیفیت یقین خود بخود اس کے نفس میں پیدا ہو جاتی ہے ،مثلاً جب آدمی آفتاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ روشن ہے کہ اس کو اندھے کی طرح فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ روشنی کا مفہوم اور مصداق کیا ہے اور دیکھنے کے کیا معنے ہیں اسی طرح ان

تمام اشیاء کو جن کا تعلق بصارت سے ہے دیکھتے ہی یقین ہو جاتا ہے کہ وہ فلاں چیز ہے اور اس کی یہ کیفیت ہے علی ھذا القیاس کل حواس سے جو جو امور متعلق ہیں ان کا ادارک کرنے کے بعد یقین کی کیفیت نفس میں پیدا ہوتی ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے ،مگر اس ادارک میں شرط یہ ہے کہ محسوسات کے ساتھ حواس متعلق ہوں یعنی وہ چیزیں اس کے پاس موجود ہوں اور حواس سے ان کا ادارک کرے ،اس صورت میں ممکن نہ تھا کہ غائب چیزوں کا علم آدمی کو حاصل ہو حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر شخص سے غائب چیزیں اتنی کثرت سے ہوتی ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ،اگر تحصیل یقین کا مدار صرف تعلق حواس ہی پر ہوتا تو بے انتہا اشیاء اور عجائب روزگار کے علوم جو وقتاً فوقتاً مختلف مقاموں میں ظہور میں آتے ہیں فوت ہو جاتے ،کیونکہ ممکن نہیں کہ آدمی اپنی ذات سے ہر جگہ پہنچ کر ان سب کا ادراک کرسکے ،اس لئے حکمت بالغہ ،خالق عزوجل مقتضی ہوئی کہ ایک حاسہ ایسا بھی ہو کہ اشیائے غائبہ کا علم اس کے ذریعہ سے حاصل ہوا کرے ،اور جس طرح احساس کے بعد یقین پیدا ہو جاتا ہے اس سے بھی ہواس کام کے لئے قوت سامعہ خاص کی گئی اور اس میں یہ خاصیت رکھی گئی کہ جب آدمی غائب چیزوں کا حال سنتا ہے تو اس کو ان اشیاء کا ادارک اور ان

کے وجود کا یقین ہو جاتا ہے۔ دیکھئے لندن امریکہ وغیرہ کو ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا مگر سننے سے ان کے وجود کا ایسا ہی یقین ہے جیسے حیدرآباد کے وجود کا۔ اسی طرح ہمارے بنی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی خبریں نسلاً بعد نسلٍ جو سنتے چلے آئے ہیں ان کا بھی ایسا ہی یقین ہے جیسے ہم ان کو دیکھ رہے ہیں، اس میں خوش اعتقادی کو کوئی دخل نہیں بلکہ خبر متواتر میں یہ فطرتی اثر ہے کہ اس سے یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ فطرت انسانی میں یہ بات رکھی گئی ہیکہ جو بات آدمی سنتا ہے یقین کر لیتا ہے۔ دیکھئے لیجئے کہ لڑکا جو بات کسی سے سنتا ہے یقین کر لیتا ہے سن لینے کے بعد رد وقدح کی نوبت ہی نہیں آتی مگر جب تجربہ اور کثرت مشاہدات سے اس کو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ خلاف واقعہ بھی خبر دینے والے کے حال کی تحقیق کرتا ہے، اگر تجربے سے کوئی شخص ایسا ثابت ہو جائے جو کبھی جھوٹ نہیں کہتا تو ایسا شخص کی خبر کا یقین بمقتضائے فطرت اس کو ہو جاتا ہے، اس لئے کہ جب اس فطرت کا بدلنے والا صرف تجربہ اس امر کا تھا کہ لوگ واقع بھی کہا کرتے ہیں اور تجربے ہی سے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ شخص جھوٹ نہیں کہتا تو اس لازمہ فطرت کو بدلنے والا اب باقی نہ رہا، اور بہ حسب اقتضائے فطرت ایک شخص کی خبر اس تجربے کی

وجہ سے مفید یقین ہو جاتی ہے کیونکہ تجربہ بھی مفید یقین ہے۔ دیکھئے لیجئے سم الفار جو یقینی طور پر مہلک اور قاتل سمجھا جاتا ہے یہ یقین کہاں سے حاصل ہوا ؟ اسی تجربے سے ورنہ اس کی خاصیت نہ کسی حس سے معلوم ہوسکتی ہے نہ عقل سے اسی وجہ سے محدثین کو اپنے اساتذہ کے صدق کا یقین اور ان کی روایتوں کا وثوق ہوتا تھا کیونکہ وہ اپنے اساتذہ کے حالات خارجاً دریافت کرتے اور ان کی خدمت میں مدتوں رہتے اور ان کے حالات ہر بات میں غور کرتے ، پھر جب اپنے ذاتی تجربوں سے ان کا صدق وتدین ثابت ہوتا اور یہ یقین ہو جاتا کہ وہ جھوٹ نہیں کہتے اس وقت ان کی روایتوں کو قبول کر کے قابل اشاعت سمجھتے ۔اور یہ قبول کرنا بمقتضائے فطرت تھا اس میں خوش اعتقادی کو کوئی دخل نہیں اس وجہ سے مثل اور حدیثوں کے معجزات کی حدیثوں کی تصدیق بھی بحسب اقتضائے فطرت ان کو ہو جاتی تھی ۔ دیکھ لیجئے کہ آدمی جب آفتاب کو دیکھتا ہے تو اس کے روشن ہونے کی تصدیق پر مجبور ہو جاتا ہے ممکن نہیں کہ اس کا انکار کر سکے ۔ہم نے جو لکھا کہ محدثین نے اپنے ذاتی تجربوں سے اپنے اساتذہ کی صدق بیانی کی تصدیق کی اس پر ہم فن رجال کو شہادت میں پیش کرتے ہیں۔اس سے ظاہر ہے کہ ہر ایک راوی کے حال کی تحقیق کس

درجہ ہوا کرتی تھی ،اور یہ فن کیسا مہتم بالشان رہا ہے کہ باوجودیکہ تقریباً تیرہ سوسال کے عرصہ میں ہزارہا کتابیں تلف ہوگئیں مگر اب بھی بفضلہٖ تعالی اس فن کی صدہا کتابیں موجود ہیں ،کیا سوائے اہل السنّت والجماعت کے کوئی مذہب وملت والا یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ ایسے اشخاص کے ذریعے ہمارا مذہب ودین ہم تک پہنچا ہے کہ جن کے حالات میں صدہا کتابیں لکھی گئیں اوران کی حفاظت میں وہ اہتمام کیا گیا جو دینی کتابوں کی حفاظت میں ہوتا ہے ۔اب دیکھئے کہ لاکھوں حدیثیں تلف ہوگیئں جن کا حال ہم نے ''حقیقۃ الفقہ'' میں لکھا ہے ،باوجود اس کے اب بھی صدہا حدیثیں موجود ہیں جو معجزات کو ثابت کررہی ہیں ،چنانچہ امام سیوطی نے دوجلدوں میں ایک کتاب ''الخصائص الکبریٰ'' نام لکھی ہے جس میں فقط معجزات ہی کی حدیثیں جمع ہیں ۔اہل علم دانش پر پوشیدہ نہیں کہ جب کسی کہ چیز کا وجود صدہا خبروں سے ثابت ہوتو اس کا علم تواتر کی وجہ سے یقینی ہوجاتا ہے ۔اب غور کیجئے کہ نفس معجزہ کے وجود پر تواتر ہے یانہیں ؟ یہ صدہا حدیثیں اگرسرسری نظر سے بھی دیکھی جائیں تو ہرایک حدیث میں ایک قسم کا معجزہ دکھائی دے گا کسی میں شق القمر ،کسی میں جانورں کا بات کرنا ،کسی میں زمین سے چشمے ابلنا ،کسی میں درختوں کا آنا جانا ،کسی میں چوب خشک کا رونا وغیرہ

وغیرہ امور، معجزہ صادر ہوئے جس میں کلام کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے
کہ اس پر صدہا حدیثیں اور ہزار ہا صحابہ تابعین تبع تابعین گواہی دے
رہے ہیں۔ حضرت نے اقسام کے معجزے دکھائے اگرچہ ہر ایک معجزہ کا
ثبوت دو چار راویوں سے ہے۔ دیکھئے بال کی حقیقت معلوم ہے کہ کم
طاقت لڑکا بھی اس کو توڑ سکتا ہے مگر انہیں بالوں کی موٹی رسی بنائی جائے تو
لڑکا تو کیا اس کو ہاتھی بھی نہیں توڑ سکتا۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ ہر ایک معجزہ
کی حدیث میں گو یہ قوت نہیں کہ یقین پیدا کر دے مگر صدہا اور ہزار ہا
احادیث اور راوی جو ایک زبان ہو کر کہہ رہے ہیں کہ حضرت نے اقسام
کے معجزے دکھائے ان کا اس قدر مشترک پر یعنے نفس معجزہ پر یہ اتفاق ایک
ایسی قوی اور مستحکم دلیل ہے کہ کوئی اس کو توڑ نہیں سکتا، اس لئے کہ ایسی چیز
ہے کہ چاہو مانو چاہو نہ مانو وہ خود منوا کے چھوڑتا ہے۔ پھر تواتر بھی کیسا کہ
جس کی بنیاد ایسے جلیل القدر راویوں کی خبروں پر ہے کہ صدق و تدین کی
وجہ سے ہر ایک بمنزلہ ایک جماعت کے سمجھے جاتے تھے۔ ابھی واقعہ ہے
کہ سلطان عبدالحمید خاں صاحب شاہ ترکی کی معزولی کی خبر جب دس پانچ
اخبار میں دیکھی گئی تو اس کا یقین ہوا کہ گویا ہم دیکھ رہے ہیں جس کا اثر یہ
نمایاں تھا کہ چند روز تک خواب و خور مسلمانوں کو ناگوار رہا اور خطبوں سے

ان کا نام نکال دیا؟ اور نہ یہ قرائن دیکھے گئے کہ ایسا مدبر بادشاہ جس کا لوہا سلاطین یورپ نے مان لیا ہے، تمام رعایا اور فوج ان کے احسانوں کی یورپ کو جواب دے سکیں، ان کی فوج ایسی جان نثار کہ اشارے پر جان دینے کو تیار، تینتیس سال اس رعب وداب سے سلطنت کی کہ سلاطین یورپ کو ان کے مقابل ہونے میں تامل ہوتا تھا۔ ایسا جلیل القدر بادشاہ پندرہ بیس روز کی باغیانہ سازشوں سے کیونکر معزول ہوسکتا ہے، اب غور کیجئے کیا عقل اس کو جائز رکھتی ہے کہ دس پانچ اخبار نویسوں کی خبر تو یہ اثر ہو کہ بیسیوں عقلی قرائن اس کے مخالف قائم ہونے پر بھی اس طور پر مان لی جائیے کہ جو آثار مشاہدے پر مرتب ہوتے ہیں اس پر مرتب ہوں، اور ہزارہا صحابہ وتابعین کی وہ خبر جس میں ذرہ بھی اختلاف نہیں اس قابل نہ ہو کہ مسلمان اس کو باور کریں؟ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ صحابہ صدق وردتدین میں سرآمد روزگار تھے اسی طرح تابعین وتبع تابعین جن کا عدل وتدین پر اتفاق ہے انہیں کے قدم بقدم تھے۔ پھر علمائے نے اس تواتر کو جوان تک پہنچا تھا صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں لکھ کر ہم تک پہنچا دیا۔ اگر ہم اس تواتر کو نہ مانیں تو یہ کہنا بے موقعہ نہ ہوگا کہ ہماری فطرت انسانی میں کسی قسم کا نقص واقع ہو گیا ہے کہ جو مفید علم امور ہیں ان سے بھی ہمیں علم حاصل نہیں ہوسکتا

۔جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بتواتر ثابت ہے تو اب یہ کہنا کہ قرآن میں حضرت کے معجزات کا ذکر نہیں ہے قرین قیاس نہ ہوگا ۔سید صاحب نے تفسیر قرآن میں شاہ ولی اللہ صاحب کا قول تفہیمات الٰہیہ سے نقل کیا ہے ولم یذکر اللہ شیاً من ھذہ المعجزات فی کتابہ ولم یشر الیھا قط بسر بدیع وھوان القرآن انما ھو من الاسم فلا یذکر فیہ ما ہو من تحتہ اس عبارت میں کچھ غلطی ہے اس لئے کہ سید صاحب نے اس کے ترجمے میں لکھا ہے: اس میں نادر بھید یہ ہے کہ قرآن پرتو اسم ذات کا ہے !! بہرحال سید صاحب نے جو اس سے استدلال کیا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک حضرت کے معجزات کا ذکر قرآن میں نہیں سو وہ درست نہیں، اس لئے کہ شاہ صاحب کا نہ یہ مطلب ہے کہ معجزات وجود ہی میں نہیں آئے اور نہ یہ کسی معجزے کا قرآن میں ذکر نہیں ہے، اس لئے کہ چند معجزے بیان کرکے انہوں نے اشارہ کیا کہ ان معجزات میں سے کوئی معجزہ قرآن میں مذکورہ نہیں جیسا کہ لفظ من ھذہ المعجزات سے ظاہر ہے بھلا شاہ صاحب ایسی بات کیونکر کہہ سکتے تھے جب کہ وہ جانتے تھے کہ حق تعالی نے متعدد مقاموں میں فرمایا ہے کہ جب کفار کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے کما قال اللہ تعالی وما

تاتیھم من آیۃ من آیات ربھم الا کانوا عنھا معرضین یعنی ’’جب کوئی نشانی ان کے رب کی طرف ان کے پاس آتی ہے تو وہ اس سے منہ پھر لیتے ہیں۔یعنی اس کا دیکھنا تک ان کو گوارنہیں ،اورحق تعالی فرماتا ہے اقتربت الساعۃ وانشق القمر وان یروا آیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر یعنی ’’قریب ہوئی قیامت اورشق ہوگیا چاند اور اگر کوئی آیت یعنی نشانی وہ دیکھتے ہیں تو اعراض کر کے کہتے ہیں کہ یہ ہمیشہ ہی کا جادو ہے یہ کوئی نئی بات نہیں اس قسم کے جادوتو حضرت ہمیشہ ہی دکھایا کرتے ہیں۔اب کہئے کہ اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوکہ خود کفار قائل تھے کہ ہمیشہ خوارق عادات حضرت سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں ،اور ایسے بڑے معجزے شق القمر کو بھی سحر ہی میں شامل کرلیا جس طرح اور خوارق میں کہا کرتے تھے۔شاہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ میں جو لکھا ہے۔واما شق القمر فعندنا لیس من المعجزات اس سے ظاہراًیہ معلوم ہوتا ہے کہ شق القمر کو انہوں نے معجزات سے خارج کیا۔مگر دراصل ایسا نہیں ہے چنانچہ حیدرآباد میں اسی عبارت میں ایک بار مناظرہ ہوا تھا اس میں مولوی احمد علی صاحب احراری مرحوم نے ثابت کردیا کہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ شق القمر چھوٹے چھوٹے معجزوں کی قسم میں نہیں ،چنانچہ اس مناظرے کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔مولوی

نذیراحمد صاحب نے حمائل مترجم کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مولوی شاہ عبد القادر صاحب نے اس مقام پر فائدہ لکھا ہے کہ حج کے دنوں میں آدھی رات کو کافر جمع تھے حضرت ان کو سمجھاتے تھے انہوں نے مانگی کچھ نشانی حضرت نے فرمایا دیکھو آسمان کی طرف چاند دو ٹکڑے ہو گیا ایک ان میں مشرق کو آیا اور ایک مغرب کو جب تک خوب طرح دیکھ لیا، پھر آپس میں مل گئے ، یہ نشانی تھی قیامت کی کہ آگے سب کچھ یوں ہی پھٹے گا اور جیسا موموی شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے تمام مفسروں کا اسی پر اجماع ہے ۔اور معجزہ شق القمر کا وقوع احادیث صحیحہ سے ثابت ہے بعض فلسفیایہ خیالات کے لوگ سمجھتے ہیں کہ شق القمر جو یہاں مذکورہ ہے قیامت میں واقع ہوگا تو وہ لوگ یوں ترجمہ کریں گے کہ قیامت پاس آ لگی اور یوں سمجھو کہ چاند پھٹ گیا بےشک شق القمر ایک عجیب واقعہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتا اور اسی لئے معجزہ ہے لیکن قیامت اس سے زیادہ عجیب ہے یہ تعجب ہے کہ فلسفی مسلمان قیامت کو تسلیم کریں جو زیادہ عجب ہے اور معجزے کے منکر ہوں ۔سید صاحب نے تفہیمات الٰہیہ کے عبارت مذکورہ کا ترجمہ یہ لکھا ہے کہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے ان معجزات میں سے کچھ بھی اپنی کتاب (قرآن) میں ذکر نہیں کیا اور نہ مطلق اس کی طرف اشارہ کیا

ہے اس میں نادر یہ بھید ہے کہ قرآن تو پرتو اسم ذات کا ہے ،اور شاہ صاحب نے معجزات کو اشرافات میں داخل کیا ہے جو اسم ذات سے کم درجہ ہے اس لئے انہوں نے فرمایا: پس جو چیز اس کے ماتحت ہے اس کا ذکر اس میں نہیں ہوسکتا۔اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں مگر تعجب یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب کے نزدیک کسی نبی کے معجزے کا ذکر قرآن میں نہ ہوتا تو اس وقت ان کے یہ دلیل صحیح ہوسکتی لیکن جب کہ شاہ صاحب دیگر انبیاء کے معجزات کا ذکر قرآن مجید میں تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ تفہیمات الٰہیہ کے متعدد مقاموں سے پایا جاتا ہے تو یہ بھید پھوٹ جاتا ہے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن مجید میں بلالحاظ اس بھید کے اور پیغمبروں کے معجزوں کا ذکر ہو اور بلحاظ اس بھید کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزوں کا ذکر نہ ہو! غرض کہ امام صاحب نے اس بحث کو اسی طریقے پر کیا ہے جیسے کہ ہمارے ہاں کے قدیم علمائے کا طریقہ ہے اور شاہ صاحب نے ان کو تصوف کے موہوم سانچے میں گزرے ہیں سب کا ایک ہی طریقہ ہے کہ معجزوں کے وجود میں کسی کو ذرا بھی شک نہیں ،امام فخرالدین رازی معجزہ شق القمر کے باب میں لکھتے ہیں واما کونھا معجزۃ ففی غایۃ الظھور یعنی شق القمر کا معجزہ ہونا تو نہایت ظاہر ہے۔امام صاحب تو امام ہی ہیں ،اس زمانہ

کے حکیمانہ خیال والے علماء بھی معجزات کا انکار نہیں کر سکتے ہیں چنانچہ مشہور مصری عالم محمد رشید رضا آفندی مدیر اخبار المنار جن کا دعوی ہے کہ دین اسلام عقل کے مطابق ہے انہوں نے کتاب شبہات النصاری وحجج الاسلام میں معجزات پر جو حکمائے یوروپ کے اعتراض میں نقل کر کے لکھا ہے ای سفہ اکبر من سفہ من کان یماری بالموجود الثابت بالمشاهدة اوالتواتر کالمعجزات یعنی اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہوگی کہ جس چیز کا وجود مشاہدہ یا تواتر سے ثابت ہو جیسے معجزات اس میں جھگڑا کیا جائے اور لکھا ہے هذه الموجودات التی نحس بها ولا نشک فیها قد عجزت عقولنا عن معرفة کیفیة ایجادها معجزها عن معرفة وجود المعجزات اولی یعنی یہ موجودات جن کا ہمیں احساس ہے اور دیکھ رہے ہیں جب ان کی کیفیت ایجاد کی معرفت سے ہماری عقول عاجز ہیں تو معجزات کی معرفت ایجاد سے بطریق اولی عاجز ہوں گی"۔ اور شاہ صاحب نے جو علت بیان کی ہے وہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا کیونکہ تصوف کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے، مگر عام فہم اور واقعی بات یہی ہے کہ جب کفار خود قائل تھے کہ خوارق عادات آنحضرت ﷺ سے ہمیشہ صادر ہوا کرتے ہیں تو پھر انہیں چیزوں کو ذکر کرنا کہ فلاں فلاں معجزے جو حضرت نے دیکھائے تحصیل حاصل ہے، اس لئے حق تعالی

نے ان کو ذکر نہ کر کے صاف فرما دیا وان یروا کل آیۃ لا یومنوا بھا یعنی یہ نشانیاں اور معجزے جو نبی ﷺ نے دکھائے کتنے ہی کیوں نہ ہوں آخر محدود ہوں گے، ان کافروں کی یہ حالت ہے کہ کل نشانیاں بھی دیکھ لیں تو ایمان نہ لائیں گے۔ اب کہئے جس قوم کی یہ حالت ہو کہ گویا قسم کھالی ہے کہ جو نشانی دیکھیں گے اس کو سحر ہی کہا کریں گے تو پھر ان کو ان کی منہ بولی نشانیاں دکھانے سے کیا فائدہ اسی وجہ سے مکابرہ کرنیوالوں کو جواب دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ سوائے تضیع اوقات کے اس سے کوئی فائدہ متصور نہیں، یہی وجہ تھی کہ جب ان لوگوں نے درخواست کی کہ زمین سے چشمے نکالو آسمان کے ٹکڑے گرادو وغیرہ وغیرہ تو حق تعالی نے نبی ﷺ سے فرمایا کہ سب کے جواب میں تم یہی کہدو کہ مجھے ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ،میرا کام یہی ہے کہ جو بات بذریعہ وحی مجھے معلوم ہوتی ہے میں سنا دیتا ہوں، رہا منہ بولی نشانیاں دکھانا سو وہ خدا کا کام ہے۔ یہی آخری فیصلہ تھا جس کی وجہ سے حضرت ﷺ ان کے تقاضوں سے سبکدوش ہو گئے۔ سید صاحب نے ان تمام واقعات وآیات کو نظر انداز کر کے ان چند آیات کو نقل کیا جنمیں مذکور ہے کہ کفار نے چند معجزے طلب کئے اور وہ انہیں نہیں دکھائے گئے اور یہ نتیجہ نکالا جو لکھتے ہیں کہ ’’آنحضرت ﷺ پاس جو افضل

الانبیاء والمرسلین ہیں معجزے نہ ہونے کے بیان سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین علیہم السلام کے پاس بھی کوئی معجزہ نہیں تھا''۔

اور مولوی شبلی صاحب نعمانی جن کو سرکار انگریزی سے شمس العلماء کا خطاب ملا ہے الکلام میں لکھتے ہیں: ''اصل نکتہ جو اس موقع پر لحاظ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ کفار جن باتوں کا طلب کرتے تھے ناممکن اور محال نہیں تاہم خدا نے ان کے اظہار سے اعراض کیا جس سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ گویہ باتیں خدا کے اختیار میں ہیں لیکن نبوت کے ثبوت میں ان کو پیش کرنا اسی قدیم غلطی میں لوگوں کو مبتلا رکھنا ہے ورنہ خرق عادات کے پیش کرنے سے انکار اس پر نہ تھا کہ خدا ان پر قادر نہیں'' نبوت کے ثبوت میں معجزات کا پیش کرنا غلطی نہیں بلکہ مقتضائے فطرت انسانی کو پورا کرنا ہے اور عادتُ اللہ بھی اسی پر جاری ہے جس کا حال ابھی معلوم ہوا، نیز اس آیۂ شریفہ سے ظاہر ہے **الم یاتکم نبؤ الذین من قبلکم قوم نوح وعاد وثمود والذین من بعدھم لایعلمھم الا اللہ جائتھم رسلھم بالبینٰت فردوا ایدیھم فی افواھم** یعنی ''کیا نہیں پہونچی تم کو خبر ان کی جو پہلے تھے تم سے قوم نوح کی اور عاد کی اور ثمود کی اور ان لوگوں کی جو ان کے پیچھے تھے نہیں جانتا ان کو مگر اللہ آئے تھے

ان کے پاس رسل ان کی نشانیاں لے کر پس تعجب کرنے لگے وہ“۔شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ میں بینات کے معنے معجزات لکھے ہیں اور فردوا ایدیھم فی افواھھم کے معنے لکھتے ہیں”از نہایت تعجب وانکار انگشت بدنداں گزیدند“۔دیکھئے کل رسولوں کا معجزات کے ساتھ آنا اس آیہء شریفہ سے ثابت ہے، اب اس موقعہ میں غلطی کا اطلاق کیونکر ہوسکے؟!غرض کہ منہ بولے معجزے نہ دکھلانے کی کوئی علت سوائے اسکے نہیں جو ہم نے بیان کی۔الحاصل جب تواتر سے ثابت ہوگیا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ معجزے دکھایا کئے اور معجزات کا وجود بھی تواتر سے ثابت ہوگیا تو اب کسی مسلمان کو ان کے وجود میں کلام کرنے کی گنجائش نہیں۔اس موقعہ میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ تواتر سے تو خود بخود یقین ہوجاتا ہے چاہے آدمی اس کا ارادہ کرے یا نہ کرے پھر کیا وجہ کہ اس زمانے کے بعض حضرات معجزات کا انکار کرتے ہیں؟اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کو دوسرے مشاغل کے باعث دینی کتابیں دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی اس لئے وہ خبران کو بتواتر پہونچی ہی نہیں، ان کا یقین نہ کرنا ایسا ہے جیسے کسی دیہاتی شخص سے کہا جائے کہ ہمیں بتواتر معلوم ہوا ہے کہ امریکہ ایک نہایت وسیع ملک ہے لاکھوں آدمی وہاں بستے ہیں وہ

ملک ہمارے پاؤں کے تلے زمین کی اس طرف واقع ہے، تو یہ سنتے ہی وہ کہے گا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کے پاؤں زمین سے لگے ہوئے اور سر نیچے ہیں جس طرح آدمی الٹا لٹکایا جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بغیر کسی تعلق کے اس طرح ٹھہر نہیں سکتا اور نہ ایسا گھر بن سکتا ہے کہ اس کا پایہ اوپر اور دیواریں نیچی ہوں اس لئے وہاں آبادی تو درکنار گھر بھی نہیں بن سکتا۔ کیا ایسے شخص کے انکار سے یہ سمجھا جائے گا کہ تواتر مفید یقین نہیں اور امریکہ کوئی فرضی ملک ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ یہ خیال کیا جائے گا کہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے اس کو امریکہ کے وجود کی خبریں بتواتر پہنچی ہی نہیں، پھر اگر تواتر کا اس کو علم ہو جائے اور سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے وہ اپنے انکار ہی پر قائم رہے تو اس سے اس کی عقل کا نقص ثابت ہوگا۔ اسی طرح ان حضرات کا حال ہے، اگر دینی درایت انہیں حاصل ہو اور کل احادیث پر مطلع ہوں تو بے شک ان کو بھی معجزات کا یقین ہو جائیگا، اور اگر اس وقت بھی ہٹ دھری کریں تو اسکا علاج نہیں۔ دیکھئے سوفسطائیہ ایک فرقہ ہے جو نہ بدیہیات کو مانتے ہیں نہ حسیات کو، ان کا قول ہے کہ کوئی چیز مفید علم نہیں، یہاں تک کہ اگر انکو جلایا جائے تو بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک خیال ہے۔ اب کہئے کیا انکو جلنے کا واقعی علم واحساس نہ

ہوتا ہوگا؟ کیوں نہیں، مگر سخن پروری کا کیا علاج۔ ''تحقیق الایمان'' میں ہم لکھ آئے ہیں کہ ابوجہل کا قول ہے کہ ہم محمد ﷺ کو جانتے ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں مگر یہ نہ ہوسکے گا کہ ہم ان کی تصدیق کرلیں۔ ابھی معلوم ہوا کے مادہء عالم میں سائینس دانوں کے کتنے اقوال ہیں، اوراسی مسئلے پر کیا منحصر ہے جس مسئلہ کو دیکھئے گا یہی اختلاف پیش نظر ہوگا!! اس سے بڑھ کر کیا ہوکہ ایک جماعت حکماء کے نزدیک اوردلائل تو کیا بدیہیات کو بھی مفید علم نہیں جانتی، اورایک گروہ کوحسیات میں بھی کلام ہے۔ اورسوفسطائیہ تو نہ بدیہیات کوقابل اعتبار سمجھتے ہیں نہ حسیات کو، انہوں نے دیکھا کہ عقلی دلائل ہر بات پر قائم ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ بدیہیات اورحسیات کے بےاعتبار ہونے پر بھی قائم ہوگئے اس لئے ان کی عقلوں میں یہ بات سمائی کہ عالم میں کوئی چیز موجودنہیں صرف خیال ہی خیال ہے کیونکہ اس کا علم فقط حواس کے ذریعے ہوتا ہے اورہم دیکھتے ہی کہ حواس بھی غلطی کرتے ہیں پھر کیونکر یقین ہوکہ کوئی چیز موجود ہے؟! اگران سے کہا جائے کہ تم جوکہتے ہوکہ یہ سب خیال ہی خیال ہے تواس کا تو تمہیں یقین ہوگا؟ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ اس میں بھی ہمیں شک ہے اورشک میں بھی شک ہے۔ اگراس کے متعلق تفصیل دیکھنا ہوتو شرح مواقف دیکھی

جائے۔غرض کہ ہر مسئلے میں متعارض اقوال اور دلائل مفید یقین ہو سکتی ہیں نہ حواس کی شہادتیں۔ یہ نکبت ان پر کہاں سے آئی ؟ انہیں نارسا اور ناقص عقلوں کے کرتوتوں سے کہ نہ حق دیکھیں نہ باطل، لگے دلائل قائم کرنے ۔اس سے بڑھ کر اور کیا ہو کہ بعض نے تو خالق ہی کا انکار کر دیا اور اس پر عقلی دلیلیں بھی قائم کیں، اب غور کیجئے کہ ہر بات میں اگر عقل رہنما بنائی جائے جیسے سر سید احمد خاں صاحب تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں،تو حق و باطل پہچاننے کا معیار کیا ہوگا ؟اور کیونکر یقین ہو کہ عقل نے جو بات بتائی ہے وہ مطابق حقیقت ہے؟ ہاں یہ سچ ہے جو سید صاحب موصوف اسی میں لکھتے ہیں کہ:"ان سب مباحثوں کے بعد میں نے یہ یقین کیا کہ علم یا یقین یا ایمان حاصل کرنے کا وسیلہ عقل ہے جو ان چیزں کے حاصل کرنے کے لئے آلہ ہے اور نہایت عمدہ رہنما ہے"۔سید صاحب نے جس عقل کی تعریف کی ہے وہ اسی قابل ہے کہ رہنما بنائی جائے ورنہ معمولی عقلیں تو ایمان سے روکنے کا آلہ بنتی ہیں اسی وجہ سے کل کفار نہ کسی زمانے میں ایمان لائے نہ آئندہ ان سے توقع ہے،مگر جو عقل خدا اور رسول پر ایمان لانے اور یقین کرنے کو کہتی ہے وہ یہ بھی کہتی ہے کہ اس یقین کے بعد پھر چون و چرا کی گنجائش نہیں کیونکہ جب عقل نے مان لیا کہ خدائے تعالی نے

رسول ﷺ کو اپنے پیام پہنچانے کے لئے بھیج کر اپنے مقاصد قرآن میں بیان کئے تو اب اس کو چون و چرا کی گنجائش نہیں ۔ رہا یہ کہ بعض امور سمجھ میں نہیں آتے تو وہ تقلیداً مان لئے گئے ، آخر دنیا میں بہت سے امور ایسے بھی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتے اور ان میں اپنے ہم جنسوں کی تقلید کرنی پڑتی ہے ۔ اگر اتنا بھی نہ ہو تو ایمان ہی کیا ہوا؟

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عقول ایک قسم کی نہیں ہوتیں ، جس قدر صورتوں میں تفاوت ہے بمصداق الظاھر عنوان الباطن عقلوں میں بھی تفاوت ہے چنانچہ امام فخر الدین رازی نے ''کتاب الفراسۃ'' میں لکھا ہے کہ : مزاج خواہ نفس ہی کا نام ہو یا آلہ ہو جس سے افعال صادر ہوتے ہیں اصل ہے ، اور خلق ظاہر و باطن یعنی اعضائے ظاہری و باطن کی ساخت اس کی تابع ہے ، چونکہ یہ دونوں باہم متلازم ہیں اس لئے اعضائے ظاہری کی ساخت اور اوضاع و حرکات سے خلق باطنی پر استدلال کیا جاتا ہے ۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ غصہ ، خوف ، حیا اور جماع وغیرہ کے وقت آدمی کے چہرے میں خاص خاص قسم کے تغیرات اور ہیئتیں پیدا ہوتی ہیں اور ظاہر ہیکہ ظاہری تغیرات باطنی تغیرات کے آثار ہیں ، اس سے ثابت ہے کہ ظاہر باطن کا عنوان ہے ۔ مقصود یہ کہ جس طرح ایک آدمی کی صورت

دوسرے کی صورت سے نہیں ملتی اسی طرح ایک کا مزاج دوسرے کے مزاج سے نہیں ملتا اور مزاجوں کا تفاوت اخلاق و حالات باطنی کے تفاوت کا باعث ہے اور عقل حالات باطنی کے تابع ہوا کرتی ہے دیکھ لیجئے غصہ اور تعصب کے وقت عقل مخالفانہ دلائل قائم کرنے لگتی ہے اور موافقت کی صورت میں تائیدی دلائل قائم کرتی ہے۔اسی طرح جس کی طبیعت میں سخاوت ہو اس کی عقل سخاوت کی فضیلت اور بخل کی مذمت ثابت کرے گی اور بخیل کی عقل بخل اور مال جمع کرنے کی ضرورت اور سخیوں کی حماقت ثابت کرے گی۔غرض کہ ہر شخص کی عقل اس کے باطنی اخلاق و مزاج کے ہاتھوں میں مقید ہے۔

فزیالوجی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر کال صاحب جو اس فن کے موجد ہیں ان کو اس امر کی تحقیق کا خیال پیدا ہوا کہ ہر شخص کیا افعال و اخلاق و عادات جو مختلف ہوتے ہیں اس کا سبب کیا ہے؟ ایک مدت کی کوشش سے حدود سنہ ۱۸۰۰ء میں ان پر یہ منکشف ہوا کہ اس اختلاف کا پایا جانا ایک فطری امر ہے، وہ یہ کہ ہر شخص کے دماغ کی ساخت الگ الگ ہوتی ہے، چنانچہ وہ اور ڈاکٹر جے جی سپرزہم جرمنی وغیرہ نہ بہت سارے سروں کو چیر کے یہ تجربہ حاصل کیا کہ عقل اور قوائے نفسانی اور شہوانی وغیرہ

مختلف طاقتوں کے لئے دماغ کے مختلف حصے مقرر ہیں، اور ہر قوت کی کمی وزیادتی ان ہی حصوں کی کمی وزیادتی وغیرہ کیفیات سے متعلق ہے۔غرض کہ سائینس سے بھی یہی ثابت ہے کہ ہر شخص کی عقل اور اخلاق فطری اسباب کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔

اب غور کیجئے کہ فطری اسباب سے یا مزاجوں کے اختلاف سے جب عقول مختلف ہوں اور ہر شخص کی عقل اس کے مزاج اور اخلاق کے ہاتھوں میں مقید ہوتو ایسی چیز کیوں کر قابل اعتماد اور رہمنا بنانے کے لائق سمجھی جائے؟! عقل کو مطلقا رہنما بنانا بعینہ طبیعت اور نفسانی خواہشوں کو اپنا حاکم بنانا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب خودغرض طبیعت حاکم ہوا اور اس کو عقل جیسا وزیر مل جائے جو اس کے اغراض پورے کرنے کیلئے نئ نئ تدبیریں عمل لایا کرے تو تمدن ومعاشرہ پر اس کا کیسا برا اثر پڑے گا۔ ہر چند خودغرض طبیعتوں ہی کے شر وفساد کو دور کرنے کے لئے تمدن کا جزو اعظم سلطنت ٹھہرائی گئی مگر جب حکام بھی خودغرض ہوں تو اصلاح تمدن کی کیا صورت۔ یہ امر پوشیدہ نہیں کہ جہاں حکام خودغرض ہوں وہاں کی رعایا کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ دغل باز بدمعاش اور ظالم مرفہ الحال ہوں گے، اور مظلوم بجائے اس کے کہ ظالموں کے پنجے سے ان کو رہائی ملے خود حکام کے پنجۂ ظلم میں

گرفتار ہوں گے، جس محکمہ میں وہ جائیں چپراسی سے لے کر افسر اعلیٰ تک جتنے خود غرض ہوں اس تاک میں لگے رہتے ہوں گے کہ جس طرح بنے ان سے اپنے اغراض حاصل کرلیں، اگر کسی کے پاس ہزار روپئے جمع ہو گئے تو لاکھ کی فکر ہے اور لاکھ ہوئے تو دو لاکھ کی فکر! ڈاکوؤں کو رحم آئے تو آجائے مگر خود غرضوں سے اس کی توقع نہیں جاسکتی، یہ سب نتائج و آثار کس چیز کے ہیں؟ صرف عقل کو رہنما بنانے کے۔ بخلاف اس کے اگر کلام الٰہی کو رہنما بنایا جائے تو ممکن نہیں کہ کسی قسم کے مفاسد وقوع میں آئیں کیونکہ جب آدمی اپنی عقل کو اپنی طبیعت کی قید سے رہائی دے کر خدا اور رسول کی مطیع اور فرماں بردار بنادے تو اس سے وہ افعال صادر ہوں گے جن سے تمدن کو وقتاً فوقتاً ترقی ہوتی رہے گی اور ہر شخص نہایت آسائش سے زندگی بسر کرے گا۔ چنانچہ ہم نے ''ایمان وتمدن'' میں اس کو کسی قدر بسط سے لکھا ہے۔ امام رازی نے رسالہ مذکورہ میں لکھا ہے کہ اقلیمون نام ایک حکیم علم قیافہ میں ماہر تھا اس وقت کے بادشاہ نے اس کے امتحان کی غرض سے اپنی تصویر اس کے پاس بھیجی حکیم نے اس کو دیکھ کر کہا یہ اس شخص کی تصویر ہے جس کو زنا کی نہایت رغبت ہے، چونکہ بادشاہ پارسا مشہور تھا لوگوں نے اس کی تکذیب کی مگر بادشاہ یہ سن کر اس کی قیافہ شناسی کا قائل

ہو گیا اور اس سے ملاقات کر کے کہا فی الحقیقت میری طبیعت کا یہی حال و مقتضی ہے مگر میں نے اپنے نفس کو اس درجہ مرتاض کیا ہے کہ کبھی اس کا مرتکب نہیں ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آدمی اپنے نفس کو مطیع فرمان الٰہی کر سکتا ہے جس سے تمدن کو نفع پہنچتا ہے الحاصل ہر بات میں عقل کو رہنما بنانا قطع نظر اس کے کہ مضر تمدن بھی ہے، اس کی بجائے کلام الٰہی کو رہنما بنانا تدین اور تمدن دونوں کو نافع ہے۔ آج کل سود خواری اور تصویر کشی وغیرہ مسائل میں جو رسالے لکھے جارہے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ عقل رہنما بنائی جارہی ہے کہ جس طرح ہو سکے روپیہ جمع کر لیا جائے جس سے اس جہاں کی آسائش حاصل ہو اور عالم جاودانی سے کوئی تعلق نہیں، بخلاف اس کے اگر کلام الٰہی کو رہنما بنایا جاتا تو ہر کام میں خدائے تعالیٰ کا ذکر ہوتا جس سے علاوہ اصلاحِ معاش و تمدن کے، ابدالآباد کی آسائش بھی حاصل ہوتی۔

سید صاحب نے عقل کو پیشوا بنا کر اس پر یہ متفرع کیا کہ امور محسوسہ کے خلاف میں کوئی بات قرآن میں نہیں ہو سکتی، چنانچہ تحریر فی اصول التفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''اب ہمارے سامنے دو چیزیں موجود ہیں (۱) ورکا فگاڈ یعنی خدا کا کام (۲) ورڈ آف گاڈ یعنی خدا کا کلام، یعنی قرآن مجید۔ اور ورک آف گارڈ اور ورڈ آف گاڈ کبھی مختلف نہیں ہو سکتے، اگر مختلف ہوں تو

ورک آف گاڈ تو موجود ہے جس سے انکار نہیں ہوسکتا اور اس لئے ورڈ آف گاڈ جس کو کہا جاتا ہے اس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے (نعوذ باللہ منھا) اس لئے ضروری ہے کہ دونوں متحد ہوں''۔

سرسید صاحب جو لکھتے ہیں کہ خدا کے کام جو ہمارے سامنے موجود ہیں جن کا انکار نہیں ہوسکتا اس کے خلاف کلام الٰہی نہ ہوگا ایک حد تک صحیح ہے اس لئے کہ جو چیز وجود میں آتی ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں کسی آیت قرآنی کی وہ مخالف نہیں بلکہ جتنے عجائب وغرائب اور ورک آف گاڈ ہمارے سامنے موجود ہے حق تعالیٰ اپنے کلام معجز بیان میں اجمالاً سب کی خبر دے چکا ہے کما قال اللہ تعالیٰ **سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق** یعنی ''قریب ہے کہ ہم بتادیں گے ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کی ذاتوں میں تا کہ ان پر ظاہر ہوجائے کہ وہی حق ہے''۔ دیکھئے یہ وعدہ کس طرح پورا ہوا اور ہوتا جارہا ہے؟ کیسے کیسے عجائبات اور قدرت کی نشانیاں اِس آخری زمانے میں ظاہر ہوتی جارہی ہیں۔ ہر چند موجد ان کے عقلا ہیں مگر وہ سب تعلیم الٰہی کا اثر ہے کیونکے ارشاد ہے ''**وعلّم الانسان مالم یعلم** ''یعنی خدا نے انسان کو ایسے امور کی تعلیم کی جن کو وہ جانتا نہ تھا اور **ویعلّمکم مالم تکونوا تعلمون**

یعنی ''اے لوگو حق تعالیٰ تم کو وہ وہ امور سکھلائے گا جن کو تم اب تک نہیں جانا کرتے تھے''۔غرض کہ یہ سب عجائبات قدرت جو خوارق عادات ہیں کہ کسی زمانے میں ان کا وجود نہیں ہوا تھا حق تعالیٰ حسب وعدہ ظاہر فرما رہا ہے۔اگر ان عجائباتِ قدرت کا ذکر گزشتہ زمانوں میں کیا جاتا کہ آئندہ ایسی چیزیں ظہور میں آئیں گی تو وہ ایسی ہی دوراز قیاس سمجھی جاتیں جیسے اس زمانے میں معجزے خیال کئے جاتے ہیں۔فونوگراف اور ٹیلگراف،ریڈیو، لاسلکی، (ٹیلیویژن) وغیرہ کا حال کسی ناواقف شخص سے کہا جائے تو عقل کی راہ سے ہرگز اس کی تصدیق نہ کرے گا،اور فونوگراف کی بات اور کنکریوں کی تسبیح کو،اور سرعت سیر میں ریل وہوائی جہاز وتار برقی اور تخت سلیمان وتخت بلقیس علیہما السلام کو ایک ہی قسم کی بات سمجھے گا۔ایسا بیہوش شخص جس کا جسم بھی چیرا پھاڑا جائے تو اسکو کچھ خبر نہ ہو،اس سے ایسے کام لینے جو چلنے پھرنے اور سمجھ سے متعلق ہوں بعینہ ایسا ہی ہے جیسے حیوانوں اور آلات (اور روبوٹوں) سے حیرت انگیز کام لئے جائیں۔علامہ فرید وجدی نے''کنز العلوم واللغہ'' میں اور دوسرے مسمریزم کے تجربہ کاروں نے اپنی تصنیفات میں لکھا ہے کہ ھپناٹائزم یعنی نوم صناعی یا عمل تنویم میں آدمی جو بیہوش کیا جاتا ہے اس کے جسم کی عجیب

حیرت انگیز حالت ہوتی ہے کہ قوانین فزیولوجیا سے بالکل بے تعلق ہو جاتا ہے، جسمانی احساس اس کا بالکلیہ جاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں تو بھی اس کو خبر نہ ہوگی، چنانچہ کئی بیماروں کا اس عمل کے بعد آپریشن کیا گیا مگر اس چیر پھاڑ کی ان کو کچھ خبر نہ ہوئی، اگر اس کے کان کے پاس طپنچہ سر کیا جائے تو اسکو خبر نہیں ہوتی اور نہ کسی کی بات وہ سنتا ہے، لیکن عامل کتنی ہی پست آواز سے بات کرے وہ سن لیتا ہے پھر اس پر عمل کر کے اس کا جواب دیتا ہے۔ دیکھئے یہ قانون فطرت کے کس قدر مخالف ہے کہ اس بیہوشی کی حالت میں کہ اعضاء کاٹ ڈالیں تو بھی خبر نہ ہو، ایسی پست آواز سن لے جو دوسرا نہ سن سکے اور پھر پوری تعمیل کرے اور برابر جواب دے۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ فرانس میں امتحان کی غرض سے ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں دو مشہور ڈاکٹر مارچ اور اسکرول شریک تھے، چار اوقیہ محلول نوشادر لایا گیا جس کی تاثیر یہ ہے کہ سونگھتے ہی آدمی مرجاتا ہے، کئی منٹ مسلسل شخص معمول کو وہ سنگھایا گیا مگر کچھ اثر نہ ہوا، پھر جب کئی بار سنگھانے پر بھی کچھ اثر نہ ہوا تو ڈاکٹروں کو اس محلول کے بارے میں شبہ ہوا یہاں تک کہ ایک ڈاکٹر نے اس کو سونگھنا چاہا ناک کے قریب لے جاتے ہی فوراً مر گیا، جس سے یقین ہوا کہ شخص

معمول پر زہر کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ سم قاتل زندہ شخص پر اثر نہ کرے؟! ہم نے مانا کہ عامل کے تصور کا وہ اثر ہوگا مگر عامل خود یہ تصور کر کے سونگھے کہ وہ اثر نہیں کرتا تو کیا بچ جائے گا؟ ہرگز نہیں، کیونکہ جو آثار معمول سے صادر ہوتے ہیں اس میں نوم غریق شرط ہے۔ اب کہئے کہاں گئی اس زہر کی صورت نوعیہ جس کا اثر کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے؟! ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حق تعالیٰ نے جو خبر دی ہے کہ ان پر آگ سرد ہوگئی اس کا انکار بعض نے اسی وجہ سے کیا تھا کہ آگ کی صورت نوعیہ کا جسم کو نہ جلانا محال ہے۔ اب کہئے کیا عقل جائز رکھتی ہے کہ ایک شخص کی قوت نفسی صورت نوعیہ کے تاثیر کو روک دے اور خدائے تعالیٰ نہ روک سکے؟ حاشا وکلّا!

کتب مذکورہ میں لکھا ہے کہ شخص معمول پر امور غیبیہ کے انکشاف کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کل رکاوٹیں اس کی نظر کے سامنے سے مرتفع ہوجاتی ہیں، مقفل صندوق میں اگر خط رکھا ہو تو دور سے اس کو پڑھ لیتا ہے، گزشتہ اور آئندہ وقائع کی خبریں برابر دیتا ہے، اگر کسی بیمار کا حال پوچھا جائے تو بیماری کا نام اور اس کے اسباب وعلامات اور علاج ٹھیک ٹھیک بیان کر دیتا ہے۔ علامہ فرید وجدی نے رسالہ الحیات میں لکھا ہے کہ پروفیسر جوزفین

نے ایک لڑکی پر عمل مسمریزم کیا جس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی اور اس سے آئندہ کے واقعات دریافت کئے جو اسکی ذات سے متعلق ہوں اور اس نے پہلے وہ واقعات بیان کئے جو ۲۵، ۳۲، ۴۰ اور ۴۵ سال میں پیش آنے والے تھے اور ان کے آثار بھی چہرے پر نمایاں ہوتے جاتے تھے، اس کے بعد موت کے واقعات کی نوبت آئی اور اس وقت کرسی پر سے گر پڑی اور نزع کی سی حالت شروع ہوئی جو اس کے کرب واضطراب سے معلوم ہوتی تھی اس کے بعد اس نے اپنی موت کی خبر دی چنانچہ اس وقت وہ کرب واضطراب بھی فرو ہوگیا، پھر جنازے کی حالت بیان کی کہ اس کو لے جارہے ہیں اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس بیچاری کا مرنا ہی اچھا ہے اور کہا کہ پادری نے جو دعائیں کی تھیں ان سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس کے بعد اس کو ہوش میں لانے کی تدبیر کی گئی اور جس طرح کوئی شخص کسی مقام تک جا کر واپس ہوتا ہے اور اس کا گزران تمام منازل پر ہوتا ہے جو اس راہ میں پیش آئے تھے، اس طرح اس کو واپسی کے وقت تمام واقعات پیش آئے جن کی پہلے خبر دی تھی، یہاں تک کہ حالت موجودہ تک پہنچی اس کے بعد ہوش میں آگئی۔ دیکھئے مابعد الموت تک کے واقعات کا صرف انکشاف ہی نہیں بلکہ ان کے آثار مرتب ہونا کس قدر دور از قیاس ہے۔

زمانہ موجود میں آئندہ زمانوں کے وقائع اور حالات جو ان زمانوں میں ہونے والے ہیں سب معدوم ہیں وہ کس طرح پیش نظر ہوئے ہوں گے ؟ حالانکہ معدوم اشیاء کو دیکھنا محال سمجھا جاتا ہے۔اب اگر کل معدومات جو آئندہ موجود ہونے والے ہیں خالق عالم کے پیش نظر رہیں تو کونسی بڑی بات ہے۔ہم لوگوں پر حق تعالی کا کس درجہ فضل وکرم ہے کہ ایسی کھلی کھلی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے جن سے لاینحل عقدے حل ہوتے جاتے ہیں،اگر اس پر بھی نہ مانیں تو حجت الٰہی قائم ہوگئی صدق اللہ تعالی حیث قال ''سنریھم آیاتنا فی الافاق وفی انفسھم''۔

منشی ابناپرشاد جن کو مسمریزم میں ید طولیٰ حاصل ہے اور اس فن کی تعلیم کی غرض سے انہوں نے ایک رسالہ بنام ''زندہ کرامات'' شائع کیا ہے اس میں جسم لطیف نکالنے کا طریقہ بتلا کر کرنل الکاٹ صاحب کا ذاتی تجربہ جو تھیا فسوٹ'' میں انہوں نے لکھا ہے بیان کرتے ہیں کہ ایک رات انہوں نے اپنے جسم لطیف کو گھر کے کسی کمرے میں اس غرض سے بھیجا کہ ایک مضمون جو ان کو یاد آگیا تھا اُس کو اِس مسودہ میں بڑھادے جو مقفل صندوق میں رکھا ہے،جب صبح کو انہوں نے دیکھا تو صندوق مقفل ہے اور مسودہ میں وہ مضمون حسب خواہش بڑھادیا گیا ہے،اور ان کی میڈم

صاحبہ نے خبر دی ہے کہ ان کا جسم دیوار سے نکلا اور لکھنے کے کمرمیں گیا اور کاغذوں کو الٹ پلٹ کرنے کی آواز بھی آئی۔ دیکھئے دیوار سے جسم کا نکلنا اور مقفل صندوق میں رکھے ہوئے کاغذ پر لکھنا مشاہدے سے ثابت ہو گیا ،اسی قسم کی باتیں جب مسلمان لوگ کہتے تھے تو انکی تضحیک ہوتی تھی۔مگر اب امید ہو چلی ہے کہ اس نئی روشنی میں چلنے والے حضرات اپنے دقیانوسی خیالات سے ضرور توبہ کریں گے۔ کنز العلوم واللغہ اور کتب مسمریزم میں لکھا ہے کہ: شخص معمول عامل کا اس قدر مسخر اور تحت تصرف ہو جاتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ دے اس کا وہ فقط یقین ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے آثار بھی اس پر نمودار ہو جاتے ہیں، مثلاً اس کے جسم پر ہاتھ رکھ کر وہ کہہ دے کہ یہاں آبلہ ہے تو فوراً آبلہ نمایاں ہو جائے گا،اور جس کام کے کرنے کو وہ کہہ دے گو معمول کے خلاف شان اور خلاف عادت ہو مگر فوراًاس کی تعمیل کرے گا۔اصل یہ ہے کہ اس کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ میں کیا کر رہا ہوں، نہ اس کو اس وقت سمجھ ہے نہ فہم وادرک نہ قصد نہ ارادہ بلکہ وہ اپنے عامل کا محض آلہ کار بنا رہتا ہے۔غور کیا جائے کہ جب عامل کو یہ قدرت ہو کہ آدمی کو جانور (یا مشین) بنا کے کام لے تو خدائے تعالی اگر ہدہد سے نامہ بری کا کام لے تو قدرت الٰہی کے مقابلہ میں وہ کونسی بڑی بات ہے۔ کنز العلوم

میں مجلّہ فرنساوی سنہ ۱۸۹۶ء سے نقل کیا ہے کہ ایک عامل نے اپنے معمول کو باور کرایا تو بھیڑیا ہے یہ سنتے ہی وہ اٹھا اور بازار کی طرف دوڑا اور آٹھ آدمیوں کو ہلاک کر کے ان کا گوشت کھا گیا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ ایک بے ہوش شخص کو اپنے عامل کی بے اصل خبر پر اتنا وثوق ہو کہ یقین سے متجاوز ہو کر حق الیقین کی نوبت پہنچ جائے جس پر آثار مرتب ہوں تو ہوشیار آدمی کو اپنے خالق کی واقعی خبروں پر کتنا وثوق ہونا چاہئے مگر افسوس ہے کہ بعضوں کو اس کا ظن غالب بھی نہیں ہوتا۔ معتزلہ جو سحر کے منکر ہیں اگر اس زمانے میں ہوتے اور یہ واقعہ دیکھتے تو ہرگز اس کا انکار نہ کرتے۔ حیوان ناطق کو حیوان مفترس بنا دینا سحر نہیں تو کیا ہے! اگر اس شخص کے روبرو کوئی معقولی صاحب دلائل لمیّہ اور انیّہ پیش کرتے اور مناظرے کے قانون سے پیش آتے تو وہ بھیڑیوں ہی کے قانون سے پیش آتا۔ اس تقریر کے بعد سرسید صاحب نے ابطال سحر کے باب میں جو تقریر تہذیب الاخلاق میں کی ہے وہ دیکھ لی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان مشاہدات نے ان کے عقلی دلائل پر پانی پھیر دیا۔ رسالہ عمل تسخیر میں حکم محمد شریف صاحب الی ڈاکٹر شفاء خانہ لاہور نے ڈاکٹر ہیڈک صاحب کے کئی تجربے مسمریزم سے متعلق بیان کئے ہیں جس میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں (۱)

جب شخص معمول مسماۃ ''ایما'' کوکسی چیز کی تصویر دی جاتی تو اس حالت بے ہوشی میں بغیر دیکھے صرف انگلی کو اس پر پھیر کے کہے دیتی کہ یہ فلاں چیز کی تصویر ہے اور طرفہ یہ کہ جس چیز کی وہ تصویر ہوتی اس کی تاثیرات اس پر نمایاں ہوتیں مثلاً گلاب کے کانٹوں یا شہد کی مکھیوں کی تصویر اس کو دی جاتی تو انگلی پھیرنے کے ساتھ ہی اس کو پھینک کر غصے سے کہتی کہ یہ کیسی سخت کانٹے دار چیز ہے! اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا کہ اس کے کانٹے اس کی انگلی کو چبھ گئے ہیں۔ دیکھئے یہ اس تصویر کا حال ہے جو عکسی تھی جس کا ادراک بغیر بینائی کے کسی دوسرے حاسہ سے ممکن نہیں، اب کہئے کہ انگلی کو بصارت کہاں سے آگئی جس پر اس کا ادراک موقوف ہے۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قوت تاثیر عامل سے ایک جدیدہ حاسہ پیدا ہو گیا کہ تصویر کے چھونے سے کانٹے کی چبھن جیسا ادراک ہوا، کیا اس واقعے کے بعد بھی شک کو ان اخبار الٰہیہ میں گنجائش ہے جو قرآن شریف میں مذکورہ ہیں کہ قیامت کے روز زمین اپنی خبریں دے گی اور ہاتھ پاؤں وغیرہ منکروں کے اعمال کی شہادت دیں گے۔ (۲) ہیڈک صاحب نے اپنی قرابت دار عورتوں کو جو لندن میں رہتی تھیں بذریعہ خط وکتابت معلوم کروایا کہ ہم فلاں وقت شہر بولٹن سے ایما کو تمہارے یہاں بھیج کر دریافت کریں گے

کہ تمہارے گھر میں اس وقت کیا کیا سامان موجود ہے؟ چنانچہ وقت مقررہ پر ''ایما'' کو بے ہوش کرکے لندن بھیجا کہ فلاں مکان میں اس وقت کونسی اشیاء موجود ہیں؟ اس نے فوراً اس مکان میں پہنچنے کی خبر دی اور جو اشیاء وہاں موجود تھیں بہ تفصیل انکو بیان کرکے ملکہ کے حالات بھی بیان کئے ،جب پوچھا گیا کہ بغیر فرمائش ملکہ کے حالات بیان کرنے کی کیا وجہ؟ تو کہا تمہاری ایک رشتہ دار عورت جس کا نام ''لام'' ہے مجھے وہاں لے گئی وہ تو اندر جانہ سکی مگر میں سپاہیوں کے اوپر سے ملکہ کے گھر میں چلی گئی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ لام اس وقت ملکہ کے گھر کا خیال کررہی تھی۔اب غور کیجئے کہ ایک ادنی عورت کی روحانی قوت یہ ہو کہ آنکھیں بند ہیں اور ہزارہا کوس سے صرف آدمیوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے خیالات کو بھی دیکھ رہی ہے تو بزرگان دین جس کی روحانیت اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی ہے اگر ہمارے حالات اور خیالات پر مطلع ہوں تو کونسی بڑی بات ہے؟ ناواقف لوگ اپنے پر قیاس کرکے اس قسم کے امور میں ناحق جھگڑتے ہیں ۔(۳) ایک عورت نے ہیڈک صاحب سے اپنے گم شدہ لڑکے کا حال پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ انہوں نے ایما پر عمل کرکے دریافت کیا اس نے اس لڑکے کا حلیہ بیان کے کرکے بتادیا کہ اس وقت وہ فلاں مقام میں ہے

۔دیکھئے ایما ایک مجہول شخص کو تمام دنیا میں سے ڈھونڈ نکالے اس کے تمام حالات پر مطلع ہو جائے تو پھر بعض اولیاء اللہ جن کا تصفیہء روحانی کمال درجے پر پہونچ گیا ہے ان کا تمام عالم پر مطلع ہونا کیوں محال سمجھا جاتا ہے (۴) ایک شخص نے اپنی بیمار لڑکی کا حال بیان کیا کہ ڈاکٹر اس کے علاج سے عاجز ہو گئے ایما نے کہا اس لڑکی کے دماغ کے پچھلے حصے میں سخت سوزش ہے اس کا علاج یہ ہے کہ شہر مانچسٹر کے فلاں مقام میں ایک ڈاکٹر ہے اسکے یہاں ہزاروں چھوٹی چھوٹی شیشیاں رکھی ہیں مگر فلاں مقام میں ایک بکس ہے اس میں بھی کئی شیشیاں ہیں ،ایک شیشی میں چھوٹی چھوٹی گولیاں ہیں وہ کھلائی جائیں تو اس کو صحت ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔یہ ظاہر ہے کہ اگر دماغ پیش نظر ہو بھی جائے تو سوزش کا ادارک کسی حاسہ سے ممکن نہیں پھر تمام دنیا کے دواخانوں میں سے ایک دواخانہ اور اس میں سے ایک بکس اور اس سے ایک شیشی منتخب کرنا جس سے خاص اس مرض کو تعلق ہے کیسی حرت انگیز بات ہے؟ مگر ایما پر وہ کچھ بھی دشوار نہ ہوا اب اگر تصفیہء روحانی کے ساتھ ایمان بھی ہو تو علم غیب کے کیسے کیسے عقدے حل ہوں گے !جس سے معلوم ہوگا کہ جو علم غیب خاصہ جناب باری ہے وہ کوئی اور ہی ہے جس میں کسی کو دخل نہیں ۔الحیات میں لکھا ہے

کہ ''جبریل وولن'' ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۸۵۱ء میں ہم انیس آدمی ایک کمرے میں بیٹھے تھے کہ میز جو ہمارے سامنے تھا حرکت کرنے اور اونچا ہونے لگا بہتیرا ہم لوگوں نے روکنا چاہا مگر نہ رکا یہاں تک کہ لمپ کو پہنچا جو سقف میں لٹکا ہوا تھا۔ علامہ فرید وجدی نیکنز العلوم واللغہ میں لکھا ہے کہ: یہ امر مکرر تجربوں اور تحقیقات سے یوروپ میں مسلم ہو چکا ہے کہ روحیں بلائی جاتی ہیں، اور وہ بالکل آدمی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، اور ان میں گوشت خون ہڈی وغیرہ اشیاء بھی موجود رہتی ہیں اور ان سے جب دریافت کیا گیا کہ یہ اشیاء تم میں کیونکر آئیں تو انہوں نے خبر دی کہ یہ سب عاریتی ہیں جو واسطے سے یعنی اس شخص سے لی جاتی ہے جو انہیں بلاتا ہے چنانچہ اس کا تجربہ بھی ہو گیا کہ واسطہ کا نصف وزن کم ہو جاتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جسم کے نیچے کا حصہ خالی ہو گیا پھر جب وہ چلی جاتی ہیں تو اس شخص کا وزن اور جسم اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ اب بتائیے کہ روح جو ایک لطیف چیز ہے کثیف جسم کیونکر بنی حالانکہ اصول عقلیہ پر قلب ماہیت محال ہے؟ پھر جسم جس وقت اس سے علحدہ کیا جاتا ہے تمام لوگ اس شخص کے گرد وپیش موجود ہوتے ہیں اور مکان روشن ہوتا ہے تاریکی نہیں ہوتی کہ چوری سے لیجانے کا احتمال ہو اور طرفہ یہ کہ آدھا جسم غائب ہو گیا اور

صدائے برنخواست ! کسی زندہ کی آدھی نہیں پاؤ ہڈی چرا کے دیکھ لیجئے کہ کیسی ہانک پکار ہوتی ہے اور چوری بھی کسی صفائی کے ساتھ کہ آدھا جسم غائب ہے مگر جب تک تولا نہ گیا معلوم ہی نہ ہوا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں سحر میں اسی قسم کے صدہا واقعے وجود میں آتے ہیں، چنانچہ چشمدید واقعات سنے جاتے ہیں کہ جانوروں کے تھنوں میں سے مسکہ چرایا جاتا ہے۔ مگر یہ امور جب بیان کئے جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ سب پرانے خیالات بے اصل محض ہیں، چنانچہ سر سید صاحب نے بھی مسئلہ سحر میں بہت کچھ خامہ فرسائی کی اور تہذیب الاخلاق کے کئی صفحے اس کے ابطال میں لکھ ڈالے ! کیا ان مشاہدات کے بعد بھی ان اٹکل کی تخمینی دلیلوں کو فروغ ہوسکتا ہے؟۔ اب اور سنیئے کہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خبر دی تھی کہ شیطان آدمی کے باطن میں وہاں تک پہنچتا ہے جہاں تک خون سرایت کرتا ہے اسکی تصدیق اب تک صرف ایمانی طریقے سے ہوتی تھی اور اس کا تسلط ایک خاص طور پر خیال کیا جاتا تھا جس کا بیان عقلی طور پر دشوار تھا، اسی وجہ سے سر سید صاحب نے شیاطین و جنات کے وجود کا انکار ہی کر دیا تھا، مگر فلسفہ جدیدہ نے ان کے وجود اور بدن انسانی میں ان کے تصرفات کو ایسے طور پر ثابت کر دکھایا ہے کہ اس حدیث شریف کی پوری پوری تصدیق

ہوگئی اور سید صاحب کی ان تمام تقریروں پر پانی پھر گیا جو ابطال شاطین وجنات میں کی تھیں۔ ع

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

اگر کہا جائے کہ فلسفہ جدیدہ سے ارواح کا وجود ثابت ہوتا ہے اس میں شیاطین کا ذکر نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ڈاکٹروں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ سوائے مادیات اور محسوسات کے عالم میں کوئی اور اشیاء ہیں، پھر جب انہوں نے اس قسم کی موجودات کو دیکھ لیا تو اب وہ حیران ہیں کہ ان کا نام کیا رکھیں؟ چنانچہ کنزالعلوم میں لکھا ہے کہ استاد کروگس اور دومرجان کا قول ہے کہ ہم ان وقائع کا انکار نہیں کرسکتے اس لئے ہم خود متعدد بار کثرت سے یہ روحانی واقعات دیکھ چکے ہیں مگر یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس بارے میں دو فرقے ہوگئے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ وہ مردوں کی روحیں ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ معلوم نہیں وہ ارواح ہیں یا دوسرے عالم کی کوئی اور چیزیں ہیں۔ اور اسی میں جنون کی بحث میں لکھا ہے کہ استاد سریوب امریکی نے تمام شفاء خانوں میں انتباء لگوادیا یہ خیال نہ کیا جائے کہ جنون فقط مرض دماغی ہے بلکہ کبھی شریر ارواحوں کے مسلط ہونے سے بھی ہوتا ہے اور اس کا علاج وہ

نہیں جو ڈاکٹر جانتے ہیں۔ دیکھئے یہ اس آیہ شریفہ یتخبطہ الشیطان من المس کی تصدیق ہے جس بناء پر تمام اہل اسلام میں مشہور ہے کہ ’’جن کا سایہ ہوا کرتا ہے‘‘ ، اور اب تک اس کا انکار کیا جاتا ہے تھا۔ غرض کہ سائنس دانوں نے چونکہ انوکھے موجودات کو ابھی ابھی دیکھا ہے اس لئے نہ وہ ان کے نام جانتے ہیں نہ حقیقت ، اور حق تعالی نے پہلے ہی سے ان کے نام اور حقیقت بتلا دی ہے ، کما قال اللہ تعالی وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون اور ان کی حقیقت یہ بتلائی کہ وہ آگ سے پیدا کئے گئے ہیں کما قال اللہ تعالی وخلق الجان من مارج من نار اور یہ بھی معلوم کر دیا کہ شیطان جن ہے ، چنانچہ اس واقعہ کا ذکر فرمایا جو شیطان نے آدم علیہ السلام پر اپنی فضیلت ثابت کرنے کی غرض سے کہا تھا کہ میری تخلیق آگ سے ہے اور ان کی تخلیق کیچڑ سے ! کما قال اللہ تعالی قال انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین ۔ غرض کہ ہمارے دین میں شیاطین وجن کے جو حالات مذکور ہیں حکمت جدیدہ نے ان کو مشاہدے سے ثابت کر دکھایا ، اب رہا نام سو وہ اپنی اپنی اصطلاح ہے ، دیکھ لیجئے انسان کا نام بھی ہر زبان میں الگ الگ ہے ۔ اگر کہا جائے کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان آدمی کو نظر نہیں آتا جیسا کہ اس آیۂ شریف میں ہے انہ یرا کم ھو وقبیلہ من حیث لا

ترونھم ؟اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان اور اس کا لشکر اب بھی نظر نہیں آتا مگر چونکہ حق تعالی نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہم اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کی ذاتوں میں دکھادیں گے کما قال اللہ تعالی سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم اس وعدے کو پورا کرنا لازم تھا اس لئے ہزار ہا نشانیاں ظاہر ہوتی جارہی ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ جنات وشیاطین کو دکھادیا کہ آفاق میں اور ان کی ذاتوں میں تصرف کیا کرتے ہیں ۔الحاصل خدائے تعالی اپنی قدرت کی نشانیاں ہمیشہ بکثرت دکھاتا ہے، ہم نے چند واقعات جو یہاں لکھے ہیں ان کو ’’مشتے نمونہ از خروارے‘‘ سمجھنا چاہیے فاضل فرید وجدی نے رسائل الحیات وغیرہ میں لکھا ہے کہ یورپ میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف ہوچکیں اور ہوتی جاتی ہیں جن میں اسی قسم کے واقعات لکھے جاتے ہیں ۔اور لکھا ہے کہ ’’کامیل فلامریون‘‘ جو یورپ میں ایک مشہور فلاسفر ہے اور اعلی درجے کے مصنفین علوم میں شمار کیا جاتا ہے جس نے مسائل روح میں ایک مبسوط کتاب سنہ ۱۹۰۰ء میں لکھی ہے وہ لکھتا ہے کہ:

’’اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ موجودات عالم اسی قدر ہیں جو حدود افق میں ان کے پیش نظر ہیں اور کرسیوں پر بیٹھے کہتے ہیں کہ جن چیزوں کا علم ہمیں حاصل ہے وہی کافی ہے اور جو چیز ان کے سمجھ میں نہیں آتی اس کا

انکار کر دیتے ہیں، کشش زمین ہی کے مسئلے کو انھوں نے علم سمجھ رکھا ہے، ہر زمانے میں ان قسم کے لوگ رہتے ہیں ان کا زعم باطل یہ ہوتا ہے کہ ہم کل وجود کی ترکیب کے بھید سمجھ گئے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے دو چیونٹیاں کسی باغ میں فرانس کی تاریخ بیان کریں اور ہم میں اور آفتاب میں جو فاصلہ ہے اس میں گفتگو کریں''۔ اس کے بعد کئی نظیریں اس بات کی پیش کیں کہ ہر زمانے میں علمی ترقی اور نئی ایجادوں کے وقت پرانے خیال والے ضرور مخالفت کرتے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ واقعہ بیان کیا کہ: ایک روز میں انجمن علوم فرنساویہ میں بیٹھا تھا کہ ''اڈیسن'' جو موجد فونوگراف ہے اس کا وکیل فونوگراف اس غرض سے لایا کہ انجمن علمیہ میں بھی اس کی تصدیق ہو جائے، جب آلہ گردش کرنے لگا اور اس کے نقوش سے آواز بلند ہوئی تو حضار جلسہ میں سے ایک پیر مرد عالم کمال جوش غضب سے اٹھا اور نہایت نا ملائم اور سخت سست الفاظ کہتے ہوئے اس ایجنٹ پر جا پڑا اور اس کا گلا گھونٹ کر کہنے لگا اے شقی ہم جیسے علماء کو ایک ایسا شخص دھوکا دے سکتا ہے جو شعبدہ کر کے اپنے پیٹ کی آواز سنائے اور اس کو فونوگراف کی آواز بتائے! کیا عقل اس کو باور کر سکتی ہے کہ ایک حقیر معدنی چیز انسانی آواز کا سامان مہیا کرے؟ غرض کہ ڈاکٹر کامیل فلا مریون سے پرانے خیال

والوں کی خوب ہی خبر لی، کونسے پرانے خیال والے؟ جو نئے خیال والے کہلاتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا شان کبریائی ہے کہ کل جو لوگ ہم پر پرانے خیالات کا الزام لگا کے اقسام کی پھبتیاں اڑاتے تھے آج انہیں پر وہ الزام الٹ پڑا! اب جب تک وہ اپنے خیالات سے توبہ کر کے خوارق عادات کے قائل نہ ہوں اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔ فاضل وجدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حیرت انگیز واقعات کے تجربے اس کثرت سے ہوتے رہے ہیں کہ یورپ اور امریکہ میں ان کا عام چرچا ہے، چنانچہ مجلّہء المجلات فرنساویہ میں ''وسل والاس'' (جو فن فرنیالوجی میں سب سے برتر مانا گیا ہے) اس کا قول نقل کیا ہے کہ اس وقت ان حیرت انگیز واقعات کی حقیقت پر بیس ملیون افراد اقرار کرتے ہیں جن میں ہر فن کے علماء شامل ہیں۔ چونکہ یہ خوارق عادات اس قسم کے نہیں ہیں جو کسی کے عقل میں آجائیں، باجود اس کے بڑے بڑے فلاسفر اور سائینس دان ان کے قائل ہونے لگے تو مخالفین نے ان کی تحقیق کی غرض سے ایک مجلس قائم کی جس میں لندن فرانس، امریکہ، جرمنی اور اٹالیا کے نامی وگرامی بڑے بڑے فلاسفر جو ہر فن حکمت کے ماہر تھے ارکان قرار پائے اور صدہا علماء بطور خود شریک رہتے تھے، اٹھارہ مہینے یہ مجلس برابر کام کرتی رہی، اس مدت میں ماہرین

فنون نے بہتیرا چاہا کہ کسی نہ کسی تدبیر سے ان خوارق میں شبہات پیدا کردیں مگر چونکہ وہاں رؤیت اور مشاہدات تھے کسی سے کچھ نہ ہوسکا ،آخر سب کو اقرار کرنا پڑا کہ وہ کل واقعات جو وقتاً فوقتاً ظہور میں آتے گئے سب واقعی اور چشم دید ہیں، وہم یا خیال کو ان میں کوئی دخل نہیں، یہ تحریری اقرار کر کے اپنی سابقہ کی غلطی کا اقرار کرلیا، پھر تو ہر طرف اخبار شائع ہونے لگے اور کئی کتابیں تصنیف ہوگئیں اور ماہواری رسالے جاری ہوئے، چنانچہ بیس سے زیادہ رسالے اس وقت یورپ وامریکہ میں جاری ہیں جن میں نئے نئے واقعات اور تحقیقات ان خوارق کے متعلق درج ہوتی رہتی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ ''جبریل ولن'' کی کتاب (حادثۂ روحیہ) جو پانچ بار طبع ہوچکی ہے اس میں لکھتا ہے کہ: ''اب سے کچھ عرصہ پہلے ممکن تھا کہ مادہ پرست ان مسائل میں کلام کرسکیں، لیکن اب ان کا ہمیں کچھ خوف نہیں، اب ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ جس کو ان خوارق عادات میں شک ہو وہ آئے اور ہر طرح سے اپنا اطمینان کرلے''۔ اور لکھا ہے:

''طرفہ یہ ہے کہ جب امتحان کیا جاتا ہے ایک نئی خرق عادت ظاہر ہوتی ہے''۔ الغرض خوارق عادات سے عقلی دنیا میں عجیب سناٹا ہے جدھر دیکھئے جوق در جوق دانشوں میں انگلی دبائے نقش بہ دیوار نظر آتے ہیں، کیونکہ

ایک مدت خاک چھان کر عالم کی تحقیق کی تھی یک بارگی سب پر پانی پھر گیا اور ایک ایسا روشن عالم پیش نظر ہو گیا کہ جس کو دیکھ کر عقل حیران ہے۔ بہر حال یہ خوارق عادات بھی ''ورڈ آف گاڈ'' یعنے خدا کے کلام کے موافق ہیں کیونکہ حق تعالی اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلانے کا وعدہ فرما چکا ہے کما قال اللہ تعالی سنریھم آیاتنا فی الافاق وفی انفسھم شاید سرسید صاحب کا مطلب عبارت مذکورہ بالا سے یہ ہوگا کہ ورک آف گاڈ کے مطابق ورڈ آف گاڈ ہونا چاہیئے، اور اس سے مقصود یہ ہوگا کہ جو معمول کے مطابق کام دنیا میں ہو رہے ہیں کلام الٰہی میں ایسی چیزوں کی خبر ہونی چاہیئے اور خوارق عادت چونکہ معمولی کام نہیں اس لئے کلام الٰہی میں ایسی چیزوں کا ذکر درست نہیں! مگر ہمیں اس میں کلام ہے، ہم ضرور پوچھیں گے کہ کیا وجہ ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں تو خوارق کا ذکر درست ہو اور کلام الٰہی میں درست نہ ہو؟ کیا یہ خوارق ورک آف گاڈ میں داخل نہیں؟ ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ صرف معمولی کام خدا کے ہوں اور غیر معمولی یعنی خوارق خدا کے کام نہیں ارواح وغیرہ اپنی خود مختاری سے ایسے کام کر لیتے ہیں، اور (نعوذ باللہ) خدا ان پر قادر نہیں!! جب تمام موجودات عالم خدا کے کام تسلیم کر لئے گئے تو ان خوارق کو ان میں سے نکالنے کی کوئی وجہ نہیں، غرض کہ یہ ضرور ماننا پڑے

گا کہ جتنے خوارق عادات قرآن شریف میں مذکورہ ہیں وہ سب ’’ورک آف گاڈ‘‘ میں داخل ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ ورک آف گاڈ اور ورڈ آف گاڈ بالکل ایک دوسرے کے عین مطابق ہیں جن کی ضرورت سید صاحب سمجھتے ہیں۔ سید صاحب نے تفسیر القرآن میں کئی دلیلیں قائم کی ہیں کہ معجزات سے رسالت ثابت نہیں ہوسکتی: (۱) ’’جو امر کہ واقع ہو اس کی نسبت اس امر کے لزوم کا ثبوت نہیں ہوسکتا کہ جس شخص سے وہ واقع ہو وہ رسول ہوتا ہے‘‘۔ گو سید صاحب کے نزدیک اس کا ثبوت نہ ہو، لیکن اوپر بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ معجزے دیکھ کر ایمان لاتے تھے ان کو مختلف قرینوں سے یقین ہوجاتا تھا کہ وہ معجزے سوائے نبی کے دوسرے سے صادر نہیں ہوسکتے، اسی وجہ سے کوئی دوسرا خواہ ساحر ہو یا حکیم ان کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ دیکھ لیجئے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں ساحر آتو گئے مگر آخر ان کو ماننا پڑا کہ موسیٰ بے شک خدا کے رسول ہیں اور ان کا معجزہ ان کی رسالت پر دلیل ہے، پھر ایمان میں وہ اس قدر راسخ ہوئے کہ فرعون جیسے ظالم بادشاہ کی دھمکیوں کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا اور جان دینے پر مستعد ہوگئے، جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے، اگرچہ یہ لزوم عقلی نہ ہو مگر عادۃ اللہ جاری ہے کہ معجزات کے دیکھنے سے طالبین حق ضرور ایمان

لاتے ہیں ۔(۲)"کوئی خرق عادت ایسی معلوم نہیں ہے جو بطور خاصہ رسول سے مخصوص ہو۔ ہر خرق عادت قرائن سے مقارن ہونے کے بعد خاصے کا حکم پیدا کرتی ہے ، جیسے تخت وتاج وجود قرائن کے بعد بادشاہ کا خاصہ سمجھا جاتا ہے ۔(۳)" کچھ ثبوت نہیں کہ خرق عادات سے رسالت کو کیا تعلق ہے"۔ بہت بڑا تعلق ہے جیسے تخت وتاج اور شاہی تمغوں کو معزز عہدیداروں سے تعلق اور اختصاص ہوا کرتا ہے۔ شمس العلماء شبلی صاحب الکلام کے صفحہ ۷۲ میں لکھتے ہیں کہ: "ایک شخص کہتا ہے کہ میں ہندسہ دان ہوں اور اس کی دلیل پیش کرتا ہے کہ میں بیس دن تک مسلسل بھوکا رہ سکتا ہوں ،تو وہ گو بیس دن تک بھوکا رہے لیکن اس سے اس کا ہندسہ دان ہونا کیونکر ثابت ہوگا ؟ اسی طرح ایک شخص کہتا ہے کہ میں پیغمبر ہوں جس کے یہ معنے ہیں کہ وہ سعادت دارین کا رہنما ہے، اسکی دلیل پیش کرتا ہے کہ وہ لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے اس سے پیغمبری کیونکر ثابت ہوگی ؟ دلیل کو دعویٰ کے ساتھ کیا ربط ہے"۔ فی الحقیقت لاٹھی کو سانپ بنا دینا رہنمائی کی دلیل نہیں ،اور نہ ان کا ایسا دعویٰ تھا کہ ہم لاٹھی کو سانپ بناتے ہیں اس لئے رہنما ہیں ، بلکہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے تمہاری رہنمائی کے لئے ہمیں بھیجا ہے اور ایک نشانی دی ہے ،تم جانتے ہو کہ ہم بھی تمہارے جیسے

بشر ہیں ہم میں کوئی ذاتی قدرت نہیں کہ لاٹھی کو سانپ بنادیں اور کوئی قلب ماہیت کرسکیں اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ ہمارا کام نہیں بلکہ اسی کا کام ہے جس نے ہمیں بھیج کر یہ نشانی بطور دلیل ہمیں دی ہے، اگر اس نشانی میں تمہیں شک ہو تو تم میں سے کوئی یہ کام کر دکھائے اور اپنے سے نہ ہوسکے تو جادوگروں وغیرہ سے مدد لے۔ الحاصل دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے ہمیں بھیجا ہے اور وہ نشانی یعنی معجزہ اس کی دلیل ہے، ایسا دعویٰ جس کی صحت کو سوائے خدائے تعالی کے کوئی جان ہی نہیں سکتا اس کے لئے ایسی ہی دلیل چاہیئے تھی جس کے موجود کرنے پر سوائے خدائے تعالی کے دوسرا قادر نہ ہو، اگر معجزے کی ضرورت نہ ہوتو مقتدائے قوم بننے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ اوائل میں معجزے کی شرط نبوت ہونے کی وجہ سے مدعیان نبوت کو بدنما حیلوں کی ضرورت ہوتی تھی ، چنانچہ ''اسود عنسی'' جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا تھا ، اس کے روبرُو سے ایک گدھا جارہا تھا اتفاقاً گر گیا اس نے اسی کو معجزہ قرار دے کر کہا کہ دیکھو وہ مجھے سجدہ کررہا ہے، پھر جب وہ اٹھنے لگا تو کچھ کہہ دیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کے حکم سے وہ اٹھ رہا ہے۔ اسحاق مغربی نے دس برس تک گونگا رہ کر ایک رات ایسی تدبیر کی کہ لوگ حیران

ہو گئے اور اس کو معجزہ سمجھ کر اس پر ایمان لائے۔ اس قسم کے کئی واقعات مدعیان نبوت کے ہم نے ''افادۃ الافہام'' میں نقل کئے ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہے کہ مدعیان نبوت کو خوارق عادات کی شکل میں اپنی تدابیر ظاہر کرنے کے لئے بڑی بڑی محنتیں اٹھانے کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اور بعض سادہ لوح جن کو قدرتی امور اور شعبدوں میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ تھی وہ ان کے دام میں آ بھی جاتے تھے۔ مگر کامل الایمان عقلاء پر ان کا افسون کچھ اثر نہ کر سکا اس لئے ان کے پیش نظر وہ آیۂ شریفہ تھی جس میں صاف ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین ہیں آپ کے بعد ممکن نہیں کہ کوئی دوسرا نبی ہو سکے۔ آخر زمانے کے بعض مولویوں نے خیال کیا کہ یہ آیت نبوت کی سدِّ راہ ہے جب تک مسلمانوں کا اس پر اعتقاد رہے گا دعوائے نبوت میں کامیابی ممکن نہیں اس لئے کہا کہ خدا نے حضرت کو خاتم النبیین کہہ دیا تو کیا ہوا اب بھی اس کی قدرت میں ہے کہ جس کو چاہئے نبی بنادے علمائے اہل سنت نے ان سے کہا کہ اگر ایسا ہو تو خدائے تعالی کے کلام میں کذب لازم آئے گا؟ کہا کیا نقصان ممکن ہے کہ خدائے تعالی کی کوئی بات جھوٹی ہو جائے۔ چنانچہ امکانِ کذب کا مسئلہ فی زماننا ایک مہتم بالشان قضیہ ہو رہا ہے۔ خدا کا فضل

ہے کہ دیگر علمائے اہل سنت اس کے قائل نہیں ہوئے ورنہ اہل مذاہب باطلہ کو خصوصاً سرسید صاحب کو موقعہ مل جاتا اور جو بات ان کے خلاف مرضی ہوتی مثلاً معجزات یا مسائل معاد جن میں کوئی چسپاں تاویل نہیں ہوسکتی تو صاف کہہ دیتے کہ ممکن ہے کہ (نعوذ باللہ) خدائے تعالی نے وہ بات چھوٹ کہہ دی ہو، اور اس دلیل الزامی کا جواب نہ ہوسکتا۔ غرض کہ اس مسئلے نے تو مدعیان نبوت کے اور بھی حوصلے بڑھا دیئے۔ چنانچہ مرزا صاحب قادیانی نے تو نبوت کا دعویٰ کر ہی دیا، اور معجزات سے سبکدوشی کی یہ تدبیر نکالی کہ ''بعض انبیاء علیہ السلام سابق مسمریزم میں مشاق تھے اس لئے وہ خوارق عادات ان سے ظہور میں آئے تھے جو دوسروں کے اقتدار سے خارج تھے، اگر یہ عمل بدنمانہ ہوتا تو میں ان سے بھی زیادہ خوارق عادات دکھلا دیتا''۔ پھر یہ بات بتائی کہ معجزے جو انبیاء سے صادر ہوتے تھے وہ عقلی تھے، چنانچہ خود بھی ایسے عقلی معجزے دکھلایا کرتے تھے۔ سرسید صاحب نے دیکھا کہ اگر معجزوں کا جھگڑا لگا رہے تو عقلی معجزوں کی بھی تدابیر میں تضییع اوقات ضرور ہوگی اس لئے صاف کہہ دیا کہ معجزے وعجزے کوئی چیز نہیں، چنانچہ اس پر تفسیر القرآن وغیرہ تصانیف میں بڑی بڑی طولانی بحثیں کیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ: کسی نبی سے معجزے کا ظہور

ہوا ہی نہیں اور نہ وہ ممکن ہے اور نبوت کو اس درجہ عام کردیا کہ وہ ایک فطری چیز ہے نہ اس کے لئے جبرئیل کے آنے کی ضرورت ہے نہ کتاب کی، عقلمندوں کے دل میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں بس وہی وحی ہے! جس کا ماحصل یہ ہوا کہ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کہنے کی ضرورت ہے نہ قرآن کو واجب العمل کہنے کی۔ غرض کہ نبوت کو نہایت ارزاں کردیا اگر مانع ہے تو صرف حیا ہے اگر وہ حجاب بھی اٹھادیا جائے تو پھر کون روک سکتا ہے! چنانچہ مرزا حیرت صاحب بھی دبی زبان سے نبوت کا دعویٰ کررہے ہیں جس کا حال ابھی معلوم ہوا۔ دراصل نبوت ایک باوقعت چیز من جانب اللہ جو مانی جاتی تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے اس دعویٰ پر کہ خدا کی طرف سے آئے ہیں کھلی نشانیاں پیش کرتے تھے جن کے دیکھنے سے سب کو یقین ہوجاتا تھا کہ اس قسم کی نشانیاں جعلی نہیں ہوسکتیں۔ معجزات اور نشانیوں کی ضرورت اس مثال سے منکشف ہوسکتی ہے کہ مثلاً بادشاہ اگر کسی کو اپنی طرف سے کسی قوم کا حاکم بنا کر بھیجنا چاہے تو اس کے ساتھ کسی ایسے شاہی نشان کی ضرورت ہوگی جس کو سب لوگ جانتے ہوں کہ وہ خاص بادشاہ سے متعلق ہے، پھر جب فرستادہ شخص وہ نشانی قوم کو دکھاتا ہے تو اس کے یقین کی وجہ سے یہ یقین بھی پیدا ہوجاتا

ہے کہ بے شک یہ شخص بادشاہ کے حکم سے آیا ہے اور اس کے فرمانبردار ہوجاتے ہیں،اور جولوگ نشانی دیکھنے پر بھی اطاعت نہیں کرتے عاصی اور مجرم سمجھے جاتے ہیں۔اب دیکھئے کہ یہاں باوجودیکہ ممکن ہے کہ اس شخص نے دھوکے سے وہ نشانی حاصل کی ہومگر نفس نشانی اسکے فرستادہ ہونے کو باور کراتی ہے بخلاف اس کے رسالت میں تو ممکن ہی نہیں کہ نشانی یعنے معجزہ دھوکے سے حاصل ہوسکے۔الحاصل معجزے سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ خدائے تعالی نے خاص اپنی طرف سے رسول کو بھیجا ہے اور اس یقین سے ان پر حجت قائم ہوجاتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ دعوائے رسالت اور معجزات میں ایک خاص قسم کا تعلق ہے جس کو عوام الناس بھی سمجھ سکتے ہیں۔شمس العلماء صاحب ''الکلام''(صفحہ۷۸) میں تحریر فرماتے ہے کہ اشاعرہ کے نزدیک ہر قسم کے خرق عادات عموماً ممکن ہیں یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جزء لایتجزیٰ دفعۃً عالم اور عاقل بن جائے یا یہ کہ ایک اندھا جو اندلس میں بیٹھا ہوا ہو چین کے کسی گاؤں کو دیکھ لے حکماء طبیعیین کے نزدیک بالکل ناممکن ہے۔سبحان اللہ! کیا خدا کی قدرت ہے کہ اشاعرہ نے ہزار سال پیشتر جو بات صرف ایمان کی راہ سے کہی تھی وہ اس زمانے میں مشاہدے سے ثابت ہورہی ہے کہ ایک شخص

آنکھیں بند کئے ہوئے اندلس میں بیٹھ کر چین کے پورے حالات بیان کر دیتا ہے اور ماہرین طبیعیات پرانی دقیانوسی عقلیں لئے بیٹھے رہتے ہیں اور اس کے آگے دم نہیں مار سکتے ،اور ہر طرف سے بے وقوف بنائے جارہے ہیں جن کا حال بحث مسمریزم اور ہپناٹائزم میں معلوم ہوا صدق اللہ تعالیٰ تلک الایام نداولھا بین الناس۔ شمس العلماء صاحب ''الکلام'' (صفحہ ٦٧) میں لکھتے ہیں کہ جب ہم کسی انسان کو دیکھتے ہیں تو ہم کو قطعی یقین ہوتا ہے کہ یہ شخص پہلے رحم میں تھا پھر رحم سے بچہ بن کر نکلا بچے سے جوان ہوا اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں بلکہ وہ دفعۃً پیدا ہو کر جوان ہو گیا تو ہم قطعاً یقین کرلیں گے کہ یہ شخص غلط کہہ رہا ہے اور اس کا قول باطل وافترا ہے ،اس سے ثابت ہوا کہ خرق عادت کا دعویٰ لغوبات ہے۔ یہ درست ہے کہ معمولی شخص ایسی بات کہے تو جھوٹا سمجھا جائے گا مگر مولوی شبلی صاحب مسلمانوں کو اس بات سے معاف رکھیں کہ خدا بھی بات کہے تو نعوذ باللہ وہ جھوٹا سمجھا جائے؟ اس کے نزدیک رحم سے بچہ نکال کر جوان کرنا اور ابتداءً جوان پیدا کرنا ایک ہی قسم کی بات ہے کیونکہ وہاں صرف (کُنْ) کافی ہے۔اس اقتدار کو تسلیم کرنے کے بعد عقل کو بھی اس میں کلام کرنے کی گنجائش نہیں۔شبلی نعمانی صاحب ''الکلام'' (صفحہ ٨٤)

میں لکھتے ہیں کہ: ہمیشہ دنیا میں یہ خیال رہا کہ انبیاء اور اولیاء میں ضرور کوئی امر مافوق العادات ہوتا ہے، اس خیال کا زور یہاں تک ہوا کہ انبیاء میں شان ایزدی تسلیم کی گئی ، زمانے کے امتداد اور عقل کی ترقی نے اس رتبے کو گھٹا کر کم کیا تو خرق عادات کے درجے پر آ کر ٹھہرا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے اور اپنی نبوت کا اظہار کیا تو جو لوگ خرق عادات کو لازمۂ نبوت سمجھتے تھے انہوں نے تعجب سے کہا لولا انزل علیہ آیہ من ربہ یعنی اس پر خدا کے یہاں سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اترا ؟ اسلام نے نہایت صفائی سے اس بات کو ظاہر کر دیا کہ جو چیزیں بشریت سے بالاتر ہیں وہ پیغمبر میں نہیں ہوتیں قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب۔ مولوی صاحب نے جو لکھا ہے کہ ہمیشہ انبیاء کی شان ایزدی تسلیم کی جاتی تھی مگر حضرت ﷺ کے زمانے میں صرف خرق عادت پر کفایت کی گئی ، اس کا مطلب تو ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار انبیاء کو دعوائے نبوت کے ساتھ ہی خدا سمجھتے تھے جس طرح حضرت سے معجزات کی خواہش کی حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا البتہ ایمان لانے کے بعد خوارق عادات امور دیکھ کر اس کی شان کبریائی کے قائل ہوئے۔ مگر اس صورت میں یہ صادق نہیں آتا کہ حضرت ﷺ کے زمانے میں ایمان کے بعد

معجزات طلب کئے گئے پھر جس طرح حضرت نے ابراء ذمہ کیا انبیائے سابق بھی کیا کرتے تھے۔ کما قال اللہ تعالی وَقَالُوْا ان انتم الا بشر مثلنا تریدون ان تصدونا عما کان یعبد آباؤنا فاتونا بسلطان مبین قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم ولکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ وما کان لنا ان ناتیکم بسلطان الا باذن اللہ۔ یعنی ’’کفار انبیاء سے کہا کرتے تھے کہ تم بھی ہم جیسے بشر ہو چاہتے ہو کہ ہم کو بتوں سے روک دو جن کی پرستش ہمارے آباد اجداد کیا کرتے تھے، اگر سچے ہو تو اس پر کوئی دلیل قائم کرو، انبیاء ان کے جواب میں کہتے کہ بے شک ہم بھی تم جیسے بشر ہیں لیکن خدا جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور ہم دلیل نہیں لا سکتے جب تک خدا کی اجازت نہ ہو‘‘۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ جب اجازت ہوتی ہے تو ہم معجزے دکھاتے ہیں اور یہی صفت ان میں ایسی تھی جو کہ معمولی بشریت سے بالاتر ہے کیونکہ کفار کے جواب میں بشریت کو مان کر ساتھ ہی ولکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ کی خصوصیت ظاہر کر دی۔ اگر خدائے تعالی کی منتیں اور احسانات بحسب شان کبریائی دیکھی جائیں تو آدمی کے ادراک سے خارج ہیں، معجزہ نمائی کونسی بڑی بات ہے اس سے بڑھ کر ان پر احسانات ہوا کئے۔ یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ جب بادشاہ اپنے ملک سے کسی کو اپنے

تقرب کے لئے منتخب کرتا ہے تو کیسی کیسی خصوصیات و مراعات اس کو دی جاتی ہیں جو دوسروں کے حوصلہ ءتمنا سے بھی خارج ہوتی ہیں۔ گو خزانہ نہ سہی۔ مگر بحسب خصوصیات شاہی حکم سے جس قدر چاہتا ہے خزانے سے لے سکتا ہے اور سلطنت کے اسرار پر اس کو اطلاع ہوتی ہے دوسروں کو ہونا ممکن نہیں۔ پھر جب مالک الملک و خالق عالم تمام مخلوقات سے انبیاء علیہم السلام کو برگزیدہ کر کے اپنے مقربین بارگاہ بنا لے جیسا کہ ارشاد ہے ثم اجتبینا ہم تو ان کی نسبت ایسے پست خیال کا اظہار کرنا خدائے تعالی کی بے قدری اور اس کی جلالت شان کا غلط اندازہ کرنا ہے، کما قال اللہ تعالی وما قدروا اللہ حق قدرہ۔ الحاصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے انبیاء نے جو کفار کی منہ بولی نشانیاں نہیں دکھائیں اسکا سبب یہ نہ تھا کہ وہ عاجز ہو گئے تھے، بلکہ حصول مقصود کے بعد وہ کام فضول تھے، اس لئے کہ انبیاء کی شان یہ نہیں کہ تبلیغ احکام جو مقصود بالذات ہے اس کو چھوڑ کر عجائبات دکھاتے رہیں۔ مولوی شبلی صاحب نے صفت رسالت کو لازمہ بشریت قرار دیا ہے جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے ”جو چیزیں بشریت سے بالاتر ہیں پیغمبروں میں نہیں ہوتیں“۔ اس سے لازمہ آتا ہے کہ ہر جنگلی اور کافر میں بھی صفت رسالت ہو؟ حالانکہ حق تعالی فرماتا ہے اللہ اعلم

حیث یجعل رسالتہ اورارشاد ہے واجتبینا ہم جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تمام عالم میں ممتاز ہوا کرتے تھے اوران میں یہ صفت تمام صفات بشریہ سے بالاتر تھی اوراسی قسم کی ایک دوسری صفت بھی ان میں تھی کہ حق تعالی ایسے علوم کی ان کوتعلیم فرماتا تھا کہ جن کے ادراک سے عقل انسانی قاصر ہے، اس لئے کہ ان علوم مختصہ اس عالم محسوسات سے متعلق نہ تھے اورظاہر ہیں جو چیز محسوس نہ ہواس کے ادراک کے لئے عقل بشری کافی نہیں ہوسکتی ،جیسا کہ ہم نے کتاب العقل میں ثابت کردکھایا ہے۔ ہر چند عقل میں اکثر ادراکات کی صلاحیت ہے لیکن جب آدمی سن رشد کو پہونچتا ہے تو اس کی ذاتی ضرورتیں اورنفس کی خواہشیں اس کو کچھ اس طرح مجبور کرتی ہیں کہ سوائے ان کے دوسری طرف توجہ کرنا سخت دشوار ہوتا ہے،اور چونکہ عقل ہر حاجت روائی کا ذریعہ ہے اس لئے اس کوان ہی کاموں میں لگائے رکھتا ہے۔اور علاوہ اس کے جس قوم میں وہ رہتا ہے اس کے اخلاق، عادات ،اطوار اس میں ایسے سرایت کئے رہتے ہیں کہ دوسری طرف اس کی توجہ مبذول ہی نہیں ہوتی۔ ’’آیات بینات‘‘ جس میں ابراہیم حورانی نے جدید معلومات کے عجائب جمع کئے ہیں اس میں لکھا ہے کہ ایک سال کسی شہر میں بھیڑیوں کا سخت بلوہ ہوا شہر والے ان کے ہلاک کرنے کو نکلے ،اور جس

درّے میں ان کا مسکن تھا اس کے دروازے پر آگ جلائی تا کہ دھویں سے گھبرا کر نکل پڑیں، چنانچہ کئی بھیڑیے نکلے، ان میں ایک لڑکا انسان جس کی عمر تخمیناً سات سال کی تھی وہ بھی ان کے ساتھ ان ہی کی وضع پر دوڑے جارہا تھا اسکو گرفتار کر کے سکندریہ کے یتیم خانے میں داخل کیا گیا، پھر دوسرا لڑکا بھی اسی قسم کا پکڑا گیا، اگرچہ یہ انسان تھے مگر ان کی کل عادتیں بھڑیوں کی سی ہوگئی تھیں کچا گوشت کھاتے جانوروں ہی کی وضع پر پانی پیتے لباس سے نفرت، لکھا ہے کہ باجودیکہ ایک لڑکا دس برس تک یتیم خانے میں رہا مگر اس کی وحشیانہ حرکات میں فرق نہ آیا جب بھی کسی نئے آدمی کو دیکھتا تو درندوں کی طرح ہیجان وغضب کی علامات نمایاں ہوتیں، بات کرنے کے موقعہ میں بھیڑیے کی سی آواز نکالتا۔ لکھا ہے کہ جب اس قسم کے چھ واقعے پے درپے دیکھے گئے تو اس وقت کے علماء کی رائے قرار پائی کہ بھیڑیے آدمی کے بچوں کو بھی دودھ پلا کر پرورش کرتے ہیں اور اپنی جنس میں ملا لیتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ابتدائی نشو ونما سے جب درندوں کی صحبت میں وہ رہے اور ان کے صفات ان پر اثر کر گئے تو ان کی عقل انسانی میں وہ قوت بھی نہ رہی جو معمولی آدمیوں کی عقل میں ہوتی ہے۔ اب کہئے کہ ایسا کون ہوگا جو کاروبار دنیوی کو چھوڑ کر اور تمام ہم جنسوں سے منہ

موڑ کر عقل کو ایسے کاموں میں لگائے جو دوسرے عالم میں مرنے کے بعد کام آئیں! اور بالفرض کسی نے تعلقات دنیوی سے علحدگی اختیار کی بھی تو یہ کیونکر معلوم ہو کہ کوئی دوسرا عالم بھی ہے؟ کیونکہ عقل کو تو ابتدائے نشو نما سے اسی عالم کے ساتھ تعلق رہا اسے دوسرے عالم کی کیا خبر؟ اور بالفرض کسی طریقے سے معلوم ہو بھی گیا تو افعال کی خاصیت کیونکر معلوم ہو کہ فلاں کا اس عالم میں یہ اثر ظاہر ہوگا؟! غرض کہ ممکن کہ یہ سب باتیں بغیر اس کے کہ خالق عزوجل کسی خاص بندے کے ذریعے معلوم کرائے عقل سے معلوم ہوسکیں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ رسول کو ایسی نشانی دی جائے جس سے وہ تمام عالم میں ممتاز ہوتا کہ عقلی قانون بنانے والوں اور لکچراروں کو دعوائے رسالت کی جرأت نہ ہوسکے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام گزر گئے اور نبوت ختم ہوگئی اس وقت یہ بحث کہ معجزہ کا وقوع ممکن ہے یا نہیں اور معجزوں کو رسالت کے ساتھ تعلق ہے یا نہیں؟، بعد از وقت ہے، مگر اس وقت یہ بحث جو چھیڑی گئی اس کا مقصد یہی ہے کہ لوگ یہ سمجھ جائیں کہ نہ نبوت ختم ہوئی نہ نبی کو معجزہ کی ضرورت ہے جس کا جی چاہے نبوت کا دعویٰ کرے، اور اگر کوئی دلیل پوچھے تو کہہ دے کہ مجھے یہ الہام ہوا ہے، اور خاتم النبیّن صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو

(نعوذ باللہ) منسوخ قرار دے کر دین کی پابندی سے لوگوں کو آزاد کر دے جس سے آزادی پسند ممنون ہو کر اسے اپنا مقتدا بنالیں۔ شبلی صاحب نے جولکھا ہے کہ جو چیزیں بشریت سے بالاتر ہیں وہ پیغمبر میں نہیں ہوتیں، اس کا مطلب یہی ہوگا کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس میں کوئی صفت ایسی نہیں ہوتی جو بشریت سے بالاتر ہو اس وجہ سے صفت رسالت بھی انسان کی فطرتی صفت ہے۔ چنانچہ سرسید صاحب نے اس کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے وہ تفسیر القرآن (صفحہ ۴۴) میں لکھتے ہیں کہ ”ہزاروں شخص ہیں جنہوں نے مجنونوں کی حالت دیکھی ہوگی کہ وہ بغیر بولنے والے کے اپنے کانوں سے آوازیں سنتے ہیں تنہا ہوتے ہیں مگر اپنی آنکھوں سے اپنے پاس کسی کو کھڑا ہوا باتیں کرتا ہوا دیکھتے ہیں، وہ ان ہی خیالات ہیں جو سب طرف سے بے خبر ہو کر ایک طرف مصروف اور اس میں مستغرق ہیں اور باتیں کرتے ہیں، پس ایسے دل کو جو فطرت کی رو سے تمام چیزوں سے بے تعلق اور روحانی تربیت پر مصروف اور اس میں مستغرق ہو ایسی واردات کا پیش آنا کچھ بھی خلاف فطرت انسانی نہیں ہے۔ ہاں دونوں میں اتنا فرق ہے کہ پہلا مجنون اور پچھلا پیغمبر ہے گو کہ کافر پچھلے کو بھی مجنون بتاتے تھے“۔ دیکھئے نبوت اور رسالت بشریت سے

بالاتر نہ ہونے اور فطرتی ہونے کا مطلب بھی یہی ہوا کہ نبی دیوانے یا دیوانے کے جیسے شخص کو کہتے ہیں جو خلاف واقعہ دیکھتا اور سنتا ہے!! اور غور کیجئے کہ جن لوگوں کے نزدیک ''نبوت'' کی بنیاد خلاف واقعہ امور اور مجنونانہ حرکات پر ہو ان کو دین اور انبیاء کی پیروی سے کس قدر نفرت ہوگی؟ اور ہونا چاہئے۔ باوجود اس کے جب اسلام کا دعویٰ ہو تو اس میں کسی قسم کی مصلحتیں پیش نظر ہوں گی۔ خیر الغیب عنداللہ اسلام کی قدر جاننے والے سچے مسلمانوں کو چاہئے کہ اس قسم کی نئی باتیں سننے اور پڑھنے سے احتراز کریں اور خدائے تعالی سے پناہ مانگتے رہیں۔ دیکھئے قرآن شریف سورہ قل اعوذ برب الناس پر ختم ہوتا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ ''کہو خدا کی پناہ مانگتا ہوں وسوسہ ڈالنے والے شیطانوں سے جو از قسم جن وانس ہیں''۔ فی الحقیقت وسوسہ اندازوں کی باتوں کا نہایت برا اثر ہوتا ہے، اسی وجہ سے من جانب اللہ یہ اہتمام ہوا کہ قرآن شریف کا خاتمہ اس جملے پر ہوا کہ انسانی اور جناتی وسوسہ اندازوں کے شر سے خدا کی پناہ! اللھم انا نعوذ بک منھم۔ سرسید صاحب تحریر میں لکھتے ہیں کہ ''شاہ ولی اللہ صاحب معجزات کو مسبب بہ اسباب سمجھتے ہیں اور اس قول پر معجزات کا وقوع قانون فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور ہم کو اس میں کچھ بحث نہیں ہے، بحث اس میں ہے

جب کہ معجزات کو مافوق الفطرت قرار دیا جائے جس کو انگریزی میں سوپر نیچرل کہتے ہیں، اوراس سے انکار رکھتے ہیں اور ان کا وقوع ایسا ہی ناممکن قرار دیتے ہیں جیسے کہ قولی وعدے کا ایفا نہ ہونا''۔شاہ صاحب کے قول سے ہمیں بھی انکار نہیں مگر انہوں نے یہ کہاں لکھا کہ معجزوں کے لئے یہی سبب عادی کی ضرورت ہے؟۔اور چونکہ شاہ صاحب معجزات کے قائل ہیں جیسا کہ انکی تصانیف سے ثابت ہے جس کا سید صاحب کو بھی اقرار ہے تو ان کے نزدیک مثلاً کنکریوں کے بات کرنے کا سبب یہ ہوگا کہ خدائے تعالی نے جس طرح مضغہ ء گوشت زبان کو قوت گویائی عطا کی اسی طرح کنکریوں کو عطا کی اور وہی ان کے بات کرنے کا سبب ہوا۔اگر سید صاحب اس کو قانون فطرت کے مطابق سمجھتے ہیں اس وجہ سے کہ خدائے تعالی مختار ہے جس چیز کو جو صفت چاہتا ہے دیتا ہے،تو ہمیں بھی اس میں کلام نہیں اور ہم بھی اس بات کا اقرار کرلیں گے کہ معجزات مافوق الفطرت نہیں،اور اگر سید صاحب اس بات کا انحصار اسباب عادیہ میں کریں تو وہ قابل تسلیم نہیں اور نہ شاہ صاحب کے قول سے وہ نفع اٹھا سکتے ہیں۔یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ معلول کو اسباب وعلل کے ساتھ عقلاً کس قسم کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی نطفے سے بنتا ہے مگر ان دونوں میں کوئی

مناسبت نہیں، نہ قوام دونوں کا ایک قسم کا ہے نہ صورت شکل نہ لوازم و خواص، جس سے دونوں میں مباینت تامہ ثابت ہے، اگر عادت سے قطع نظر کرلیا جائے تو کیا عقل جائز رکھ سکتی ہے کہ ایک ماء مہین سے انسان جو اشرف المخلوقات ہے وجود میں آئے؟ ایک خشک تخم سے نہایت سرسبز درخت پیدا ہوتا ہے جس میں اقسام کے شاخ و برگ، پھول پھل پیدا ہوتے ہیں بتائیے دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ دماغ جو ایک قسم کا لجلجا گوشت ہے فہم وادراک او رحواس کا خزانہ ہے، ان امور کی حقیقت اورکیفیات پر غور کرکے کہیئے کہ اس گوشت سے ان کے کیا مناسبت ؟ حالانکہ ان میں اس قدر تعلق بیان کیا جاتا ہے کہ بغیر دماغ کے فہم وادراک ممکن ہی نہیں اسی وجہ سے جمادات ونباتات کا فہم وادراک محال بتایا جاتا ہے ۔سماعت کان کے عصب میں رکھی ہے، اگر اس کو چیر کے دیکھا جائے تو اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو ہاتھ پاؤں کے اعصاب میں نہ ہو کیا عقل کی رو سے ثابت ہوسکتا ہے کہ سماعت کا اسی پر مدار ہے؟ زبان کے عصب کو ذائقہ کے ساتھ کیا خصوصیت تھی جو دوسرے اعصاب اس سے محروم رہے؟ ،آگ جو ہر چیز کو جلا کر خاک سیاہ بنادیتی ہے اس کی کیا وجہ اور ابرک کو کیوں نہیں جلاتی ؟ حالانکہ ابرک لوہے اور پتھر سے زیادہ

سخت نہیں، اور سونے اور چاندی جیسے جسموں کو وہ پگھلا دیتی ہے مگر انڈے کی زردی اور سفیدی پر اس کا وہ اثر نہیں ہوتا بلکہ برخلاف اس کے وہ اور منجمد ہو جاتے ہیں؟ یہاں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب امور فطرتی ہیں، مگر ہم پوچھیں گے کہ تاثر و تاثیر میں ہر چیز کے مادے اور صورت نوعیہ کو دخل ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ ابرک اور انڈے کی صورت نوعیہ میں یہ شان وشوکت کہاں سے آ گئی کہ دنیا بھر کی چیزیں تو آگ سے جلیں اور پگھلیں مگر وہ اس کو قبول نہ کریں؟ رہا مادہ سو وہ تو وہی ہیولیٰ یا اجزائے لا یتجزیٰ ہیں جو تمام جلنے اور پگھلنے والے اجسام میں موجود ہیں!! آخر یہی کہنا پڑے گا کہ خالق کی طرف سے یہ خصوصیات ان میں ہیں، تو ہم کہیں گے کہ جب مدار خالق ہی کے عطاء پر ہے دراصل یہ کل وسائط بے کار ہیں اور جس طرح اس نے جس چیز کو جو خاصیت چاہی دے دی، اب بھی جس کو جو چاہتا ہے دیتا ہے، چنانچہ اسی کی خبر کھلے لفظوں میں دی ہے یفعل اللہ مایشاء و یحکم ما یرید۔

اب اسباب کے تعین کا حال بھی سن لیجئے کہ حکمائے سابق نے گردش افلاک کو زمینی حوادث کا سبب قرار دیا تھا، حکمت جدیدہ نے ان افلاک ہی کو اڑا دیا اور حوادث برابر جاری ہیں!! ہمارا دعویٰ یہ نہیں کہ اسباب بیکار

محض ہیں، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ مسبب الاسباب ہے یعنے اسباب عادیہ کا محتاج اور پابند نہیں جس چیز کو وجود میں لانا چاہتا ہے اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے خواہ عادی ہوں یا غیر عادی۔ سید صاحب تفسیر کے (صفحہ ۱۰۶) میں لکھتے ہیں ''معجزہ نبوت کے ثبوت پر کیونکر دلیل ہوسکتا ہے؟ اثبات نبوت کے لئے اول خدا کا وجود اور اس کا متکلم ہونا، اور اس میں اپنے ارادے سے کام کرنے کی قدرت کا ہونا اور اس کا تمام بندوں پر مالک ہونا ثابت کرنا چاہیئے، پھر اس کا ثبوت چاہیئے کہ وہ اپنی طرف سے رسول اور پیغمبر بھیجا کرتا ہے، پھر یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ جو شخص دعوائے نبوت کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کا بھیجا ہوا ہے''۔ سر سید صاحب جس قدر احتمالات قائم کریں سب فضول اور بعد از وقت ہیں انبیاء جس زمانے میں آتے اور معجزے دکھاتے تھے کفار کو ان کی نبوت کا یقین ہو جاتا ہے جس کی خبر خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں دی ہے فلما جاتہم آیاتنا مبصرۃ قالوا ھذا اسحر مبین وجحدوابھا واستیقنتھا انفسہم اس کو سید صاحب کیا کریں گے؟ وہ تو کسی کے روکے رکتا ہی نہیں، نہ اس کے مقابلے میں کوئی دلیل آسکتی ہے نہ احتمال کیونکہ مشاہدہ اور قرآئن قویہ سے جو یقین ہوتا ہے کسی دلیل و احتمال سے زائل نہیں ہوتا۔ یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جب کوئی مسافر

ریلوئے اسٹیشن پر ٹکٹ خریدنے کے انتظار میں کہیں دور بیٹھا ہوتا ہے اور جب وہ وقت مقررہ پر گھنٹی کی آواز سنتا اور لوگوں کو ہر طرف سے دوڑتے دیکھتا ہے تو ان قرائن سے اس کو ٹکٹ بٹنے کا یقین ہو جاتا ہے، اس حالت میں اگر کوئی احتمالات قائم کرے کہ ممکن ہے کہ کسی اور غرض سے گھنٹی بجی ہوگی اور لوگ کسی اور کام کے لئے دوڑے جاتے ہوں گے وغیرہ تو وہ ہرگز کسی کے روکے نہ رکے گا۔ اسی طرح انبیاء کے پاس رہنے والوں کو وقتاً فوقتاً مختلف قرائن کے دیکھنے سے ان کی نبوت کا یقین ہو جاتا تھا اور اس کے ضمن میں اس سب باتوں کا یقین ہو جاتا کہ خدا موجود اور متکلم ہے اور اس میں ارادہ اور قدرت بھی ہے اور بندوں کا مالک ہے اور یہ رسول اسی کے بھیجے ہوئے ہیں، پھر معجزات کے دیکھنے سے تو اور بھی یقین کو قوت اور اطمینان ہو جاتا تھا۔ البتہ بعض لوگ ان میں ایسے بھی ہوتے تھے کہ باوجود یقین کے عناد اور تعصب کی راہ سے انکار نبوت کیا کرتے۔ دراصل ایمان ایک بے بہا دولت ہے جس سے ابدی سعادت اور دائمی نعمتوں کا استحقاق ہوتا ہے ہر شخص میں یہ صلاحیت کہاں کہ اسکو حاصل کر سکے، اس کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے سینوں میں انشراحی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی خبر حق تعالی نے دی ہے، قولہ تعالی افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو

علی نور من ربہ فویل للقاسیۃ قلوبھم اور ارشاد ہے فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء یعنی جس کو خدائے تعالی ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ کشادہ ورنہ تنگ کر دیتا ہے۔ یہ وہی انشراح صدر ہے جو ہر زمانے میں ہوا کیا اور اب تک خاص خاص بندوں کو ہوتا رہتا ہے، چنانچہ اس زمانہ بھی ہزاروں غیر مسلم بغیر کسی تحریک ظاہری کے اسلام کو سچے دل سے قبول کرتے جاتے ہیں، بخلاف ان کے بہت سارے مسلمان ایسے ہیں کہ ان کو تصدیق شدہ قرآن کے مسائل ماننے میں تنگ دلی ہے۔ سرسید صاحب جو لکھتے ہیں کہ اثبات نبوت کے لئے اول خدا کا وجود اور متکلم اور قادر ہونا ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ فی الحقیقت دہریوں کے مقابلے میں ان تمام امور کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ وہ خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں۔ مگر سید صاحب تو ظاہراً ان تمام امور کو مانتے ہیں صرف معجزوں میں کلام تھا، ان کو ضروری تھا کہ سوائے معجزات کے دوسرے امور کے اثبات کا بار اپنے ذمہ لیتے، اس کے کیا معنی کہ صرف اعتراض شائع کر کے جہلاء کو پریشان کر دیا کہ شاید اب تک نہ خدا کے وجود پر کوئی دلیل قائم ہوئی نہ اس کے صفات اور انبیاء کے وجود پر، اگر سید صاحب ہی کو ان امور میں شک ہو تو

اہلِ اسلام اور یہود و نصاری و مجوس اور ہنود تک کی کتابوں میں ان کے دلائل موجود ہیں ان کو دیکھ لیتے، اور اگر اس پر بھی یقین نہ آتا تو اسلام کے دعوے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دہریے موجود تھے جن کا قول تھا وما یھلکنا الا الدھر انہوں نے بھی اسلام کو قبول نہیں کیا تھا اور نہ ان پر زبردستی کی گئی تھی کہ خواہ مخواہ اسلام کو قبول ہی کرلو۔ مگر شاید اس زمانے کے دہریوں پر سید صاحب کا یہ اعتراض ہوگا کہ وہ احمق تھے کہ اجنبی رہے جس کی وجہ سے ان کا افسوس مسلمانوں پر چل نہ سکا۔ بہرحال سرسید صاحب کے اعتراضوں سے کوئی فرقہ بچ نہیں سکتا صرف مسلمان ہی ان کے جواب کے ذمہ دار نہیں۔ سرسید صاحب تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں کہ: ''قرآن میں خرق عادات کا کہیں ذکر نہیں اور جہاں لفظ آیت آیا ہے جس کے معنی نشانی کے ہیں اس سے ہمیشہ وہ احکام یا نصائح اور مواعظ مراد ہیں جو خدائے تعالی نے بذریعہ اپنے کلام یا وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں''۔ دیکھئے وہ خود فرماتے ہیں کہ آیت کے معنی نشانی کے ہیں پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہوگا کہ ہر آیت قرآنی نصیحت یا حکم کی نشانی ہے؟ اس لئے ہر چیز کی علامت اس کے مغائر ہوتی ہے، مثلاً میل کا پتھر جو ایک معین مسافت کی علامت ہے اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے

کہ وہ پتھر خود مسافت ہے، اسی طرح دھواں آتش کی علامت ہے اور اگر اس کو آتش نہیں کہہ سکتے۔ بخلاف آیت کے کہ وہ عین نصیحت یا حکم ہے اور اگر اس لحاظ سے مغایرت ثابت کی جائے کہ الفاظ آیت مغایر مضمون ہیں تو چاہئے کہ ہر کلام کو آیت کہیں خواہ ہندی ہو یا فارسی حالانکہ اس کا ثبوت نہ لغت سے ہو سکے گا نہ کسی محاورے سے۔ یہاں یہ سوال ہوگا کہ جب یہ بات نہیں تو قرآن کے ہر فقرہ کو آیت کیوں کہتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز عرب کے فصحاء نے بھی تسلیم کرلیا تھا وہ جانتے تھے کہ باوجودیکہ فصاحت وبلاغت میں یدطولیٰ رکھتے ہیں مگر اس کا مثل خود ہم پیش نہیں کرسکتے، اسی وجہ سے جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھدائکم من دون اللہ ان کنتم صادقین تو کسی فصیح وبلیغ شاعر سے اتنا بھی تو نہ ہوسکا کہ کسی چھوٹی سورۃ انا اعطینا ک الکوثر کے برابر بھی کوئی فقرہ بنا کر اس مقابلے میں سرخروی حاصل کرلیتا! حالانکہ اس زمانے میں ہر قبیلے کے شعراء وفصحاء ایک دوسرے سے مقابلہ کرکے اپنی نازک خیالیوں اور اعجاز بیانیوں سے اپنے اپنے قبیلوں کو قابل افتخار بنانے میں ہمیشہ کوشش کیا کرتے تھے۔ پھر جب ہر فصیح وبلیغ نے اپنے سکوت وعجز سے قوم پر یہ ظاہر کردیا کہ قرآن

کے کسی فقرے کا جواب نہیں ہوسکتا، تو اہل انصاف پر یہ بات منکشف ہوگئی کہ قرآن کا ہر فقرہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ خدا ہی کا کلام ہے جو مقدور بشر سے خارج ہے، اسی وجہ سے آیات کی صفت ''بینات'' کے ساتھ وارد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فقرہ قرآن کا اس مقصود پر کھلی نشانی ہے، چنانچہ حق تعالی فرماتا ہے ولقد انزلنا الیک آیات بینات وما یکفر بہا الا الفاسقون ''ہم نے تم پر کھلی کھلی نشانیاں اتاریں جن کا انکار سوائے فاسق کے کوئی نہیں کرسکتا''۔ غرض کہ قرآن مجید کا ہر فقرہ باعتبار فصاحت وبلاغت کلام الہی ہونے کی نشانی ہے جس کی وجہ سے لفظ ''آیت'' ہر فقرے کا لقب ہی ٹھہر گیا۔ اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ نشانی کسی چیز کی ایسی ہونی چاہئے کہ اس کے علم سے دوسرے چیز کا علم ہوجائے جیسے میل کے پتھر کو دیکھنے سے مسافت معینہ کا علم ہوجاتا ہے، یہی بات قرآن کے فقروں میں ہے کہ ان کے سننے سے فصحائے عرب کو اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ وہ کلام الہی ہے، اور یہ بات خود قرآن شریف سے معلوم ہوتی ہے، چنانچہ حق تعالی فرماتا ہے ومن ایاتہ خلق السموات والارض یعنی خدا کی نشانیوں میں سے آسمان وزمین کی پیدائش ہے۔ اسی طرح متعدد مقامات میں حق تعالی فرماتا ہے کہ سمجھ دار لوگوں کے لئے زمین وآسمان کی

پیدائش اور رات دن کا اختلاف اور ہواؤں اور بادلوں کا پھرنا وغیرہ آیات یعنے نشانیاں ہیں۔ دیکھئے یہ سب ایسے کام ہیں کہ مقدور بشر سے خارج ہیں ،اسی وجہ سے خدا کی ذات اور قدرت وغیرہ صفات پر دلالت کرتی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ آیت سے مراد کام ہے جو سوائے خدائے تعالی کے کسی دوسرے سے نہ ہوسکے، چونکہ ہر فقرۂ قرآن پر یہ بات صادق آتی ہے، اس لئے حق تعالی نے مثل اور امور کے جن پر آیت کا اطلاق فرمایا قرآن شریف کے ہر فقرہ کو آیت فرمایا۔ اب غور کیجئے کہ وجہ تسمیہ آیت کی جو ہم نے بیان کی ہے مطابق محاورات قرآن ہے یا وہ جو سید صاحب تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قرآن کے فقرے بھی خدا کی وحدانیت اور انبیاء کی نبوت اور احکام شریعت پر دلالت کرتے ہیں اس لئے ہر فقرے کو بھی آیت کہتے ہیں ؟اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو فقرہ وحدانیت پر دلالت کرتا ہے وہ دلالت کی وجہ سے آیت کہلاتا ہے،اسی طرح نبوت اور احکام پر دلالت کرنے والے فقرے اس دلالت کی وجہ سے آیات ٹھہرے؟ جس کا ماحصل یہ ہوا کہ الفاظ کو اپنے معنی پر دلالت کرنے کی وجہ سے آیت کہتے ہیں۔ مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ دیگر تمام کلاموں کے فقروں میں بھی یہی بات ہوتی ہے پھر قرآن ہی کے فقروں کو آیت کہنے کی کیا وجہ؟ غرض کہ یہ بات ہرگز ثابت

نہیں ہوسکتی کہ معنی پر دلالت کرنے کی وجہ سے الفاظ کو آیت کہتے ہیں۔ رہا سید صاحب کا یہ استدلال جو تفسیر معالم التنزیل میں ہے ولقد انزلنا الیک آیات بینات کی تفسیر میں لکھا ہے ’’ واضحات مفصلات بالحلال والحرام والاحکام‘‘ سو اس سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے لفظ آیات کی تفسیر کی ہے بلکہ وہ بینات کی تفسیر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ ان میں مسائل حلال وحرام اور احکام بالتفصیل واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کل آیات میں حلال وحرام اور احکام مذکورہ ہیں !! کیونکہ تمام قرآن شریف میں صرف تخمیناً پانچ سو آیات ہیں جن میں احکام حلت وحرمت مذکور ہیں باقی میں خدائے تعالیٰ کی صفات وافعال اور قصص وامثال اور جنت دوزخ کے احوال کا ذکر ہے۔ سرسید صاحب نے تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے: ’’اور جب فقرات قرآن پر اس لئے کہ وہ احکام پر دلالت کرتے ہیں آیات کا اطلاق ہوتا ہے تو آیات سے خود احکام ہی جو اس شخص کے وجود اور عظمت اور قدرت وسطوت واختیار پر دلالت کرتے ہیں جس نے وہ احکام صادر کئے ہیں مراد لئے جاسکتے ہیں‘‘۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مثلاً یاایھا الذین آمنو لاتاکلوا الربوا میں سود نہ کھانے کا جو حکم ہے وہ اس بات پر دلالت

کرتا ہے کہ یہ حکم بھیجنے والا موجود باعظمت وقدرت وسطوت ہے!! معلوم نہیں یہ دلالت کس لفظ اورکس قرینے سے ہوتی ہے؟۔ پھراسی مقام پرآگے چل کر بڑے شد و مد سے دعویٰ کرتے ہیں کہ معجزہ رسول کی رسالت پردلالت نہیں کرسکتا! دیکھئے معجزہ جس کہ ظاہرکرنے پرکوئی دوسرا قادرنہیں وہ تو رسالت پردلالت نہ کرے اورصرف حکم ربوا خدا کی قدرت ''عظمت'' سطوت اوراختیار وغیرہ پر دلالت کرے!! عجیب قسم کی سخاوت اوربخل ہے۔ سید صاحب تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: ''گومفسرین نے اکثر مقامات میں بلکہ تقریباً کل مقامات میں لفظ آیات بینات سے معجزات ہی مراد لئے ہیں مگر یہ غلطی ہے، معجزے پرآیات کااطلاق ہونہیں سکتا کیونکہ معجزہ امر مطلوب یعنے اثبات نبوت یا خدا کی طرف سے ہونے پردلالت نہیں کرتا، صرف احکام ہی ہیں جو بینات کی صفت سے موصوف ہوسکتے ہیں''۔ اس مقام پر یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ حق تعالیٰ نے جن بندوں کونبوت اوررسالت کے لئے منتخب فرمایا ان میں پہلے ہی ایسے اوصاف حمیدہ رکھے جن کی وجہ سے وہ اپنی قوم میں معزز ومحترم ہوا کرتے تھے اوریہ کوئی خلاف قیاس بات بھی نہیں ہے۔ علم فزیالوجی میں سائینس دانوں کی تحقیق سے ثابت ہے کہ جتنی صفات حمیدہ اوررذیلہ

ہیں ان کے مقامات دماغ میں علحدہ علحدہ ہیں، مثلاً سخاوت کا مقام دماغ میں ممتاز ہے، اگر وہ کشادہ ہو تو بلا تکلف صفت سخاوت ظہور میں آئیگی اگر ایسا شخص بخل کرنا چاہئے تو بھی تکلف کی ضرورت ہوگی جیسے بخیل سے سخاوت۔ اگر خدائے تعالیٰ کسی برگزیدہ بندے کے مقامات صفات حمیدہ کشادہ رکھے تو کوئی خلاف عقل بات نہیں، چنانچہ سائینس دانوں نے بھی تصریح کی ہے کہ بعض خاص خاص بندوں کی مزاجیں اعتدال حقیقی کے قریب ہوتی ہیں۔ غرض کہ صفات حمیدہ کے مقامات جب کشادہ ہوں اور ان کی مزاجیں معتدل بھی ہوں تو ظاہر ہیکہ ان کے جملہ افعال نہایت پسندیدہ اور اعلیٰ درجے کے مہذب ہوں گے، اور ظاہر ہے کہ جس شخص میں کمال عقل وسخاوت وشجاعت وعدالت اور خیر خواہِ قوم ہو وہ قوم میں ممتاز اور سب کا محمود اور محبوب ہوگا، اور بالطبع قوم اس کے وجود کو اور اس کی پیروی کو باعث سعادت دنیوی سمجھے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء اوائل میں معتمد علیہ ہوا کرتے تھے، مگر جب وہ خدمت رسالت پر مامور ہوتے اور خدا کی طرف سے ایسے پیام پہنچاتے جو ان لوگوں کے آبائی طور طریقوں کے برخلاف اور ان کے مالوفات کو چھوڑانے والے تھے تو از راہ عناد اکثر لوگ ان کے دشمن ہو جاتے اور ان کو عاجز کرنے کی غرض

سے کہتے کہ اگر تم خدا کی طرف سے آئے ہو تو کوئی نشانی بھی اس کی تمہارے پاس ہے یا یوں ہی زبانی دعویٰ ہے؟ اگر کوئی نشانی ہو تو پیش کرو، جیسا کہ اس آیۂ شریفہ سے ظاہر ہے فاتنا بآیۃ ان کنت من الصادقین یعنی اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ ، پھر متعصبوں کو ایمان لانا تو مقصود ہی نہیں تھا اس لئے کوئی نشانی یا معجزہ دیکھتے تو کہتے کہ ایسے کام تو جادوگر بھی کیا کرتے ہیں، جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے فلما جآئتھم آیاتنا مبصرۃ قالوا ھذا سحر مبین۔

چونکہ فطرت میں ایسے امور پر نشانی طلب کرنا داخل ہے اس لئے بعض اوقات پہلے ہی سے انبیاء کو نشانی دی جاتی تھی جیسا کہ آیۂ شریفہ سے مستفاد ہے اذھب انت واخوک بآیاتی یعنی خدائے تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم اور تمہارے بھائی میری نشانیاں لے کر فرعون کی طرف جاؤ، چنانچہ انہوں نے جاتے ہی سوال سے پہلے کہہ دیا کہ ہم تیرے رب کی طرف سے نشانی لائے ہیں کما قال اللہ تعالیٰ قد جئناک بآیۃ من ربک اگر بحسب مذاق سید صاحب اس کے معنے یہ سمجھے جائیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جاتے ہی کہا کہ ہم تیرے رب کی طرف سے تجھ پر احکام لائے ہیں تو وہ بھی جواب دیتا کہ احکام چہ معنیٰ

دارد حضرت پہلے آپ اپنی رسالت تو ثابت کیجئے۔ سید صاحب نے اُس زمانے کے لوگوں کو اس زمانے کے بعض اشخاص پر قیاس کیا ہوگا کہ احکام کے مان لینے میں یہ تو ضروری نہیں کہ ان پر عمل بھی کریں، مثلاً اگر فرصت ہوئی اور نمازیوں کا مجمع بھی ہے تو وضو بے وضو کسی طرح نماز پڑھ لی، اور روزوں کے لئے تو اس کی بھی ضرورت نہیں صرف یہ خیال کافی ہے کہ عرب میں چونکہ تولید خون کثرت سے تھی اس لئے وہاں فرض تھے۔ اس لئے انبیاء کو اتنا ہی کہنا کافی ہوگیا کہ ہم احکام الٰہی لائے ہیں، اور قوم نے کہہ دیا کہ خیر یہ بھی سہی ہم نے بھی مان لیا۔ اس زمانے میں ہرگز یہ بات نہ تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ایمان لانا اپنے آپ کو نبی کے ہاتھ بیچ ڈالنا ہے نہ اپنی ذات پر اپنا پورا تصرف باقی رہتا ہے نہ اہل وعیال پر نہ مال ومنال پر، اگر نبی کہہ دیں کہ کھانا پینا چھوڑ دو تو چھوڑنا پڑتا ہے، اگر لڑائی میں دس شخصوں کے مقابلے میں ایک شخص کو حکم دیں تو مجال سرتابی نہیں۔ وہ دیکھتے تھے کہ کسی جرم میں کسی پر کوڑے پڑ رہے ہیں، کسی کا ہاتھ کٹ رہا ہے، کسی کو رجم ہو رہا ہے، غرض کہ اس وقت ایمان لانا دنیوی سخت آفتوں میں مبتلا ہونا تھا، اس لئے کسی کا یہ کہہ دینا کہ ہم خدا کی طرف سے تم پر حکم لائے ہیں تم ہم پر ایمان لاؤ اور ہمارے غلام بن جاؤ کیا کافی ہوسکتا تھا؟

ہر گز نہیں جب تک دعوائے رسالت پر وہ اطمینان بخش نشانیاں نہیں دیکھ لیتے ہر گز اس غلامی کو قبول نہیں کرتے تھے اور مقتضائے عقل بھی یہی تھا۔علاوہ اس کے انبیاء علیہم السلام صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کی وجہ سے مقبول اور معتمد علیہ ہوتے ، عبادت الٰہی میں انہوں نے ایسی شاقہ محنتیں اٹھائیں اور ان کا زہد وتقویٰ اس درجے پر تھا کہ قوم پر یہ بات منکشف ہوگئی کہ ان حضرات کو دنیا سے کوئی تعلق نہیں ، اور سوائے ترقی مدارج اخروی کے کچھ مقصود نہیں ، اور ان کے صدق کا اثر دلوں پر ایسا پڑتا کہ اپنے اور بیگانے اہل انصاف بے ساختہ گرویدہ ہو جاتے ۔نواب وزیر الدولہ بہادر وزیر اعظم ریاست پٹیالہ نے یورپ کے ایک محقق فاضل مسٹر تھامس کارلائل صاحب کی تقریر جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت لکھی ہے ''اعجاز التنزیل'' میں نقل کی ہے بہ مناسبت مقام یہاں لکھی جاتی ہے:

فاضل موصوف لکھتا ہے: ''یہ ژرف نگاہ شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو جنگلی ملک میں پیدا ہوا تھا، اپنی دل میں کھپ جانے والی سیاہ آنکھوں اور شگفتہ اور با اخلاق اور پر غور طبیعت کے ساتھ جاہ طلبی کے کچھ اور ہی خیالات رکھتا تھا۔ وہ ایک ذی سکینہ اور غیر معمولی طاقتوں والی روح تھا، او

ر ان لوگوں میں سے تھا جو سوائے راست باز ہونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے اور جس کو خود قدرت نے سچا اور راست باز پیدا کیا تھا۔ جب کہ اور لوگ مقررہ عقیدوں اور روایتوں پر چلتے اور ان ہی پر قائم و قانع تھے، یہ شخص ان عقائد وروایات کے حجاب میں نہ رہ سکتا تھا اور اپنی روح اور حقائق اشیاء کے معلوم کرنے میں اوروں سے مستثنٰی تھا، اور جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے ہستی مطلق کا سرِّ عظیم مع اپنے جمال و کمال کے اس پر کھل گیا تھا اور پرانی روایتیں اس حقیقت پر جس کے بیان میں ناطقہ عاجز ہے اور جس نے اپنے تئیں ''میں یہاں ہوں'' سے تعبیر کیا پردہ نہ ڈال سکیں۔ ایسا صدق جس کا ہم نے کوئی اور بہتر لفظ نہ ملنے کی وجہ سے ''صدق'' ہی نام رکھا ہے فی الحقیقت منجملہ آثار الٰہی ہے ایسے شخص کا کلام ایک آواز ہے جو بلا واسطہ فطرت الٰہیہ قلب سے نکلتی ہے جسے انسان سنتے ہیں اور جس کے سننے میں اور چیزوں کی بہ نسبت زیادہ توجہ چاہئے کیونکہ اس کے مقابلے میں اور جو کچھ ہے وہ ہیچ ہے۔ شروع ہی سے اس کے دل میں حج کے موقعوں اور نیز روزمرہ کے ادھر ادھر چلنے پھرنے میں طرح طرح کے ہزاروں خیالات پیدا ہوتے تھے مثلاً یہ کہ: میں کیا ہوں؟ کیا تھا؟ وہ چیز جس کو لوگ دنیا کہتے ہیں اور جس میں میں موجود ہوں کیا ہے؟ زندگی کیا

ہے، موت کیا ہے، مجھے کس بات کا یقین کرنا چاہئے؟! جن کا جبل حرااور کوہ سیناء کے بڑے بڑے پتھروں کے ڈھیروں اور سخت سنسان بیابانوں نے کچھ جواب نہ دیا۔اور سر پر چپ چاپ چکر کھانے والے آسمان نے بھی مع اپنے نیلگوں روشنی والے ستاروں کے کچھ نہ بتایا، مگر بتایا تو صرف اسی کی روح نے اور خدا کے الہام نے جو اس میں تھا‘‘۔یہ ایک یورپین فاضل کی تقریر تھی جس سے باوجود بیگانگی کے بوے اُنس آتی ہے، اور ایک ہمارے سید صاحب کی بھی تقریر ہے جسے آپ نے دیکھ لیا کہ: نبی ایک خاص قسم کا دیوانہ ہوتا ہے جو خیالی باتیں کیا کرتا ہے۔

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

الحاصل اوصاف مذکورہ اور راہ خدا میں اقسام کی مصیبتیں جھیلنی، اور فقر و فاقہ میں شکر الٰہی بجالانا، اور عبادت الٰہی میں ایسی مشقتیں اٹھانی جو عموماً آدمیوں کے امکان سے خارج ہیں، اور ان کے سواء اور بہت سے امور قوم پر یہ بات ثابت کر دیتے تھے کہ جس طرح وما أسالکم علیہ من اجر یعنی اس رسالت اور رہنمائی سے ہمیں یہ مقصود نہیں کہ کسی قسم کی اجرت تم سے حاصل کریں! زبان سے کہتے ہیں ایسا ہی عمل بھی ہے۔غرض کہ انبیاء

علیہم السلام کی وہ دائمی للٰہی حالت اور وہ صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ خصوصاً صدق، خیرخواہی، خلق اللہ میں یکتائی اور دنیا سے بے تعلقی اور امتثال اوامر ونواہی خالق میں سرگرمی اور عبادت الٰہی میں محنت شاقہ، اور فقروفاقہ میں شکرگزاری وغیرہ اموراہل انصاف کے دلوں پر ایسا گہرا اثر ڈالتے تھے کہ کسی بات میں ان کے کذب وافتراء کے احتمال کو بھی موقعہ نہیں مل سکتا تھا۔ پھر جب ان امور کے ساتھ نشانیاں یعنی معجزات بھی دکھا کر کہتے کہ یہ نشانیاں خدا نے ہمیں دی ہیں تو جو لوگ کہ تعصب کی راہ سے ان کی تکذیب کرتے تھے ان کے بھی دل بے اختیار اس یقین پر مجبور ہوجاتے کہ بے شک یہ نشانیاں خدا ہی نے انہیں دی ہیں، جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے فلما جاءتھم آیاتنا مبصرۃ قالوا ھذا اسحر مبین وجحد وابھا واستیقنتھا انفسھم یعنی جب کھلی نشانیاں کفار نے دیکھیں تو جحود وانکار کی راہ سے ان کو سحر تو کہا لیکن ان کے نفوس نے اس بات کا یقین کرلیا کہ بیشک وہ نشانیاں خدا کی طرف سے ہیں۔ اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ جو علم مختلف قرائن وذرائع سے حاصل ہوتا ہے اس میں کمال درجے کا یقین ہوتا ہے، جن حضرات کی راست بازی، صدق، دیانت، خیرخواہی، خوف خدا جو عبادات شاقہ پر مجبور کرتے تھے،

اور دنیا سے بے تعلقی وغیرہ امور قوم میں مسلم اور مشاہد ہوں وہ دعوائے نبوت کر کے ایسی نشانیاں دکھائیں جو کسی دوسرے سے وجود میں نہ آ سکیں اور یہ خبر دیں کہ خدا نے ہمیں یہ نشانی دی ہے تو کیا ممکن ہے کہ اتنے قرائن کے دیکھنے کے بعد بھی کسی عاقل کو شبہ رہے؟! اس سے ظاہر ہے کہ سید صاحب جو لکھتے ہیں کہ ''معجزے اثبات نبوت یا خدا کی طرف سے ہونے پر دلالت نہیں کرتے اس لئے وہ آیات بینات ہو نہیں سکتے'' درست نہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنی ذاتی خبر دے رہے ہیں اور انبیاء کے زمانے والوں کو اپنے پر قیاس کرتے ہیں جو قیاس الغائب علی الشاہد ہے، اس قسم کے قیاسات عقلاً مفید مدعا ہو نہیں سکتے۔ سید صاحب نے نہ کبھی نبی کو دیکھا نہ ان کے اوصاف اور معجزات کو، پھر ان کو ان باتوں کی تصدیق کیونکر ہو سکتی ہے؟ جن لوگوں کے پیش نظر کُل واقعات مذکورہ تھے اگر بالفرض ان میں کوئی ایسا شخص ہو کہ باوجود ان تمام مشاہدات کے اس کی کیفیت قلبیہ میں کوئی تغیر واقع نہ ہوا ہو تو وہ خارج از بحث ہے اس لئے کہ جس کو کسی بات کا احساس ہی نہیں ہے وہ مرفوع القلم ہے جس کا شمار دیوانوں میں ہوگا۔ سر سید صاحب تحریر لکھتے ہیں کہ: تمام صفات باری نامحدود اور مطلق عن لقیود ہیں یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید پس وہ وعدوں

کے کرنے کا مختار تھا جن کو اسنے کیا اور اس قانون فطرت کے قائم کرنے کا بھی مختار تھا جس پر اس نے کسی کائنات کو بنایا ہو یا اس موجود کائنات کو بنایا ہے یا آئندہ اور کسی صورت میں بنادے، مگر اس وعدے اور قانون فطرت میں جب تک کہ وہ قانون قائم ہے تخلّف محال ہے، اور اگر ہو تو ذات باری کی صفات کاملہ میں نقصان لازم آتا ہے، اور ان وعدوں کا کرنا اور قانون فطرت پر کائنات قائم کرنا اس کی قدرت کاملہ کا ثبوت ہے، اور ان کے ایفا سے جس کا خود اس نے اپنے اختیار سے کیا ہے اس کی قدرت کے مطلق عن القیود اور نامحدود ہونے کے معارض نہیں ہوسکتا۔ سید صاحب نے یہ اصل قرار دی ہے کہ بمصداق یفعل اللہ مایشاء کے خدا نے وعدہ کرلیا ہے سب کام قانون فطرت پر چلائے گا اب اس اصول پر جتنے معجزات اور خوارق عادات ہیں سب کو جھوٹ قرار دے کر قرآن میں تاویلات کریں گے۔ مگر جس شخص کو تھوڑا بھی علم ہو جانتا ہے کہ لفظ ''ما ''یفعل اللہ مایشاء میں عام ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے نہ کسی کی عقل کا پابند ہے نہ عادت کا اور سید صاحب اس کی تخصیص کر کے اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ خدا وہی کرتا ہے جو مطابق عادت ہو جب انہوں نے اس تمام قرآن میں تصرت کرنے کا اصول قرار

دیا تھا تو ان پر لازم تھا کہ اس آیت کی تخصیص کسی دوسری آیت سے ثابت کرتے ،مگر نہ کر سکے اس لئے اس اصول پر جو کچھ متفرع ہوگا وہ سب بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ان کا کہنا کہ ان وعدوں کے کرنے کا مختار تھا ''حق تعالی نے جہاں وعدہ یا عہد کا ذکر کیا ہے اس سے یا ترغیب مقصود ہے یا ترہیب وتخویف چنانچہ خود سید صاحب نے اس مقام میں جو آیتیں ذکر کی ہیں جیسے ''وعداللہ الذین آمنوا'' وعداللہ المنافقین'' وغیرہ سب میں یہی بات ہے، کسی آیت میں خدائے تعالی نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ ہم قانون فطرت کے مطابق کام چلائیں گے ،اسی وجہ سے سید صاحب کو ایک نیا وعدہ عملی نکالنے کی ضرورت ہوئی اگر تھوڑی دیر کے لے وعدہ عملی مان لیا جائے تو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ وعدہ کس کے ساتھ ہوا مثلاً آفتاب و ماہتاب کو ایک طریقے پر چلانے کا وعدہ ان ہی کے ساتھ ہوا یا انسانوں کے ساتھ ،اگر انسانوں کے ہے تو ان کو اس وعدہ سے فائدہ ہی کیا اس سے تو وعدہ خلافی بہتر تھی کہ موسم سرمایہ میں آفتاب اور ایک آدھ چکر مغرب سے مشرق کی طرف لگاتا' پھر اس وعدے سے نہ ان کو کسی بات کی ترغیب ہوئی نہ تخویف ایسے بیکار وعدے سے فائدہ ہی کیا، اور اگر ہر چیز سے وعدہ کرلیا ہے کہ قانون فطرت کے مطابق اس سے کام لے گا تو یہ بھی

قرین قیاس نہیں اس لئے کہ اگر کوئی شخص کوئی گھر یا اور کوئی چیز کسی خاص وضع اور طرز پر بنا تا ہے تو یہ وعدہ کرتا کہ اس فطرت اور وضع کے خلاف ہرگز نہ کروں گا، اور نہ یہ سمجھا جا تا ہے کہ اس طرز و وضع میں ہرگز تصرف نہ کرے گا، اس طرح کہ جو دالان یا کمرہ کسی کام کے لئے معین کیا ہے اس سے دوسرا کام لے یا دروازہ اور سیڑھیاں وغیرہ جہاں قائم کی ہیں وہاں سے ہٹائے یا صحن میں کوئی عمارت بنائے اور اگر ایسا کرے تو وعدہ خلافی کا الزام اس پر عائد ہوا۔ جب آدمی اپنی مصنوعات میں قانون فطرت کا پابند نہیں تو قادر مطلق کو اپنی مصنوعات میں پابندی کی کیا ضرورت۔ قولہ ''ان وعدوں کا کرنا اور قانون فطرت پر کائنات قائم کرنا اسکی قدرت کاملہ کا ثبوت ہے''۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ پابند ہو جانا ہے کمال قدرت ہے یا یہ ثابت کرنا کہ ہم جس سے جو کام چاہیں لے سکتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے یفعل اللہ ما یشاء؟ اگر کوئی کہے کہ میں اپنے نوکر سے اس کی ہوش کی حالت میں معمولی کام لیتا ہوں، اس کا اقتدار زیادہ سمجھا جائے گا یا اس شخص کا جو بے ہوش سے ایسے کام لے جو کوئی ہوشیار بھی نہ کر سکے؟ مثلاً اس کے روبرو بیٹھے ہوئے ہزاروں کوس کی خبریں فوراً پہنچا دے اور بغیر اس کے کہ علم طب سے واقف ہو بیماری کی تشخیص اور دوا کی تعین کر دے، جیسا کہ

مسمریزم میں ہوا کرتا ہے، اگر کسی کی عقل حکم کرے کہ معمولی طور پر کام لینے میں زیادہ اقتدار ہے تو ایسے شخص سے گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں سوائے خاموشی کے کسی اور طریقے سے اس کا جواب دینا عقلی اصول کے خلاف ہے۔سید صاحب نے اس مقام میں بہت ساری آیتیں نقل کی ہیں جیسے وعداللہ الذین آمنو۔وعداللہ المنافقین وغیرہ اوراس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدائے تعالی نے وعدہ کیا ہے اور تخلّف وعدے کانہیں ہونے کا،اور باوجود ان وعدوں کے اوران کے عدم تخلّف کے جابجا اپنے تئیں قادر مطلق اور فعال لما یرید بیان کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وعدہ اور عدم تخلّف وعدہ اسکے قادر مطلق ہونے او راس کی صفت مطلق عن القیود ہونے کے منافی نہیں ہے''۔اس سے سید صاحب کوئی نفع نہیں اٹھا سکتے اس لئے کہ پہلے وعدہ ثابت ہوجائے تو عدم تخلّف کی ضرورت اور''فعال لما یرید'' کی تخصیص یا تعمیم کی حاجت ہو! ثبت العرش ثم النقش !اور آپ نے دیکھ لیا کہ وعدہ عملی ایک اختراعی اور فرضی چیز ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔قولہ فی التحریر:یہی حال قانون فطرت کا ہے جس پر یہ کائنات بنائی گئی ہے پہلا قولی وعدہ ہے اور قانون فطرت عملی وعدہ''۔اوراسی میں لکھا ہے کہ ورک آف گاڈ یعنی قانون

قدرت ایک عملی عہد خدا کا ہے اور وعدہ اور وعید قولی معاہدہ ہے اور ان دونوں میں سے کوئی بھی خلاف نہیں ہوسکتا۔ پہلے یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ قانون فطرت ’’کن اصولوں پر مرتب ہوا ہے اور اس کا نسخہ کونسی لائبریری اور کتب خانے میں دستیاب ہوسکتا ہے؟ اور اگر ایسی عادت کا نام قانون قدرت رکھا جائے تو چاہئے کہ خلاف عادت مستمرہ کوئی کام نہ ہوا چنانچہ خود سر سید صاحب کہتے ہیں کہ اس قانون سے کوئی مستثنٰی نہیں، حالانکہ کتب تواریخ اور اخبار کا مطالعہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں کہ ہر زمانے میں خلاف عادت امور ظاہر ہوتے رہتے ہیں جن کو درج اخبار و کتب کرنے کی خاص غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو ان خوراق عادات سے تعجب ہو، یہ کسی اخبار میں نہ ہوگا کہ فلاں آدمی کے گھر ایسا لڑکا پیدا ہوا کہ اس کی شکل آدمی کی سی ہے بلکہ کوئی عجیب الخلقت لڑکا پیدا ہو جو خلاف عادت ہو تو اس کی خبر دی جاتی ہے۔اس کے سوائے عجائب مسمریزم ابھی معلوم ہوئے کہ بے ہوش شخص عامل کی ایسی بات سن لیتا ہے جو دوسرا نہیں سن سکتا اور اس پر بے ہوشی کی حالت میں عاقلانہ عمل کرتا ہے اور اس حالت میں زہر یلا ہل بھی اس پر اثر نہیں کرتا، اور مقفّل صندوق میں رکھے ہوئے خط کو وہ پڑھ لیتا ہے، اور ہر بیماری اور اسکی دوا پر مطلع ہوتا ہے، اور

بغیر مدد حواس ہزار ہا میل کی دوری سے صرف لوگوں ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ ان کے خیالات پر بھی مطلع ہوتا ہے اور ارواح آدمی کے جسم کو علانیہ ایسے چراتے ہیں کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی اور بعضے اپنے کسی جسم کو کاموں کے لئے بھیج دیتے ہیں اور اس کو دیوار وغیرہ کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ان کے سواء بہت سارے امور ایسے ہیں جن کا ظہور اس زمانے میں ہورہا ہے، کیا یہ امور قانون فطرت اور عادت مستمرہ کے موافق ہیں۔اگر موافق ہیں تو یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ اس صدی سے پہلے اس قسم کے کام ہوا کرتے تھے۔ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ ان امور کو وہ موافقِ فطرت ہرگز ثابت نہیں کرسکتے، اور کیونکر ثابت کرسکیں گے، فطری امور تو وہ ہوتے ہیں کہ بغیر تعلیم کے عمل میں لائے جائیں۔چنانچہ خود سید صاحب نے تفسیر میں ان کی کئی مثالیں دی ہیں جیسے بیا چڑیا اور شہد کی مکھی کا گھر بنایا وغیرہ۔مسمریزم وغیرہ کے اعمال پر ہر شخص کا قادر ہونا تو کجاء لاکھوں آدمی اب تک اس کے منکر ہی اور یہی وجہ ہے کہ حکمائے یورپ وامریکہ لکھتے ہیں کہ جو پرانے خیال والے حمقاء ان خوارق پر ایمان نہیں لاتے وہ آئیں او ان کا مشاہدہ کرلیں!اب کہئے کہ یہ خوارق عادات عملی وعدے کے خلاف ہیں یا نہیں، اور چونکہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ خدائے تعالی وعدہ خلافی نہیں کرتا

تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدائے تعالیٰ نے قانون فطرت کے خلاف نہ کرنے کا وعدہ کیا ہی نہیں۔ اس تقریر سے سید صاحب کا وہ قول بھی باطل ہو گیا جو لکھتے ہیں کہ قانون قدرت جس قدر دریافت ہوا ہے وہ بلاشبہ خدا کا عملی وعدہ ہے جس سے تخلف قولی وعدے کے تخلف کے مساوی ہے جو کبھی نہیں ہوسکتا۔ سید صاحب التحریر میں لکھتے ہیں۔ خدا نے فرمایا ہے انا کل شیء خلقناہ بقدر پس جس اندازے پر خدا نے چیزوں کو پیدا کیا ہے اس سے تخلف نہیں ہوسکتا۔ یہ درست ہے کہ جس چیز کو خدائے تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس کی تقدیر کی ہے جس کی خلاف ہرگز نہیں ہوسکتا، مثلاً ابوجہل کی تقدیر میں کفر تھا گو اس نے صدہا معجزے دیکھتے مگر ایمان نہ لا سکا علیٰ ہذا القیاس ابراہیم علیہ السلام جس آگ میں ڈالے گئے تھے اس کی تقدیر اس طور پر تھی کہ ان کو نہ جلائے اس لئے جلا نہ سکی اسی طرح ہر ایک آدمی وغیرہ کے حالات ہر ایک آن کے مقدر ہیں ان سے تخلف نہیں ہوسکتا اس لئے کہ ''کل شیء'' کے معنی ہر ایک چیز کے ہیں کیونکہ یہ ''کل'' افرادی ہے مجموعی نہیں کما لا یخفی علی من له ادنی مما رسة فی العلوم۔ سید صاحب تحریر میں لکھتے ہیں پھر خدا فرماتا ہے ولکل امة اجل فاذا جاء اجلهم لا یستا خرون ساعة ولا یستقدمون پس

ممکن نہیں ہے کہ جو وقت جس چیز کے لئے مقرر ہے وہ کسی طرح ٹل سکے۔ یعنے ہر چیز اپنے وقت مقررہ تک رہتی ہے اوراس کے بعد فنا ہو جاتی ہے اسی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عالم میں جتنی چیزیں ہیں خواہ وہ ذوات ہوں یا اوصاف ان کا وجود اسی وقت تک رہے گا جب تک علم الٰہی میں وہ مقرر ہے اس کے بعد ممکن نہیں کہ ان کا وجود باقی رہے، مثلاً آگ کی حرارت صرف وقت مقررہ تک کام دے گی اسی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام کواس نے نہیں جلایا۔اوراسی میں لکھتے ہیں کہ: پھر خدائے تعالی فرماتا ہے **فاقم وجھک للدین حنیفاً فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون**

پس جس فطرت پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اس کی تبدیل نہیں ہوسکتی دوسری جگہ فرمایا ہے۔لا تبدیلا لکلمات اللہ ہمارے نزدیک کلمات اللہ اور خلق اللہ دو مرادف الفاظ ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ فطرت میں تبدیل نہیں ہوسکتی ۔ یہ درست ہے کہ فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی مگراس کا علم ہمیں نہیں ہوسکتا کہ کس کی فطرت کس طور پر واقع ہوئی، چنانچہ خود سرسید صاحب تحریر میں لکھتے ہیں۔اس قانون فطرت

میں سے بہت کچھ خدا نے ہم کو بتایا ہے اور بہت کچھ انسان نے دریافت کیا ہے، گو کہ انسان کو ابھی بہت کچھ دریافت نہ ہوا ہو اور کیا عجب ہے کہ بہت کچھ دریافت ہی نہ ہو۔ یہ بات نہایت درست اور صحیح ہے، دیکھئے مادہ و برقی کی فطرت میں جو جو حیرت انگیز عجائب رکھے ہیں ہزاروں سال تک کسی کو معلوم نہ ہوئے، اسی طرح عمل مسمریزم سے اب معلوم ہو رہا ہے کہ انسان کی فطرت میں کیسے کیسے عجائب وغرائب امور رکھے ہیں اور کیا معلوم کہ ان کے سواء اور کیا کیا عجائب اور اسرار اس میں مخزون ومکنون ہیں ایسی صورت میں معجزات کا انکار کرنا اس خیال سے کہ وہ خلاف فطرت ہیں کیونکر صحیح ہوگا۔ عقلاً ایسے خیالات کو ہرگز پسند نہیں کرتے چنانچہ ڈاکٹر کامیل فلامریون نے جو لکھا ہے ابھی معلوم ہوا کہ پرانے خیال والے کسی چیز کے سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے جو اس کا انکار کر جاتے ہیں اسکی مثال ایسی ہے جیسے دو چونٹیاں تاریخ فرانس بیان کریں اور ہم سے آفتاب تک جو فاصلہ ہے اس میں گفتگو کریں!! غرض کہ اس آیت شریفہ سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا کہ معجزات کا وقوع نہیں ہوا۔ اسی میں لکھتے ہیں پھر فرمایا ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا پس جو طریق کہ خدا نے مقرر کیا ہے اس میں تبدیل نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کا مضمون قرآن شریف میں نو (۹) جگہ وارد

ہے اکثر مقاموں میں ''سنۃ اللہ'' کی تصریح ہے کہ وہ طریقہ یہ ہے کہ جو خدا کی مخالفت کرے اس پر عذاب ہوگا، اور کسی جگہ دوسرے احکام بھی مراد ہیں، بہرحال قانون فطرت کا کہیں ذکر نہیں، مگر جب سید صاحب اس سے قانون فطرت ہی مراد لیتے ہیں تو ہمارا بھی وہی جواب ہے کہ قانون فطرت معلوم نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد آیتیں چند جن میں انسانوں کی تخلیق کا حال وارد ہے ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ علاوہ ان کے اور بہت سی آیتیں اسی مضمون کی ہیں جن میں ہم کو قانون فطرت پہ بتایا ہے کہ جوڑے سے یعنی زن و مرد سے اور نطفے کے ایک مدت معین تک مقررہ جگہ میں رہنے سے انسان پیدا ہوتا ہے، پس اس قانون فطرت کے برخلاف اس طرح نہیں ہوسکتا جس طرح کہ قولی وعدے کے برخلاف نہیں ہوسکتا۔ ابھی معلوم ہوا کہ عملی وعدہ قانون فطرت کوئی چیز نہیں، پھر اگر یہ ضروری ہو کہ انسان صرف نطفے ہی سے پیدا ہوسکتا ہے تو یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آدم اور حوا علیہما السلام کس طرح پیدا ہوئے اور وہاں کونسا جوڑا اور کس قسم کا نطفہ تھا؟ اصل یہ ہے کہ ان آیتوں سے مقصود صرف قدرت نمائی ہے کہ دیکھو انسان کو نطفے سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہے باوجود اس کے ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا، جس سے عقلاء سمجھ لیں کہ وہ قادر مطلق جو چاہتا

ہے کرسکتا ہے، اگر عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر نطفے کے پیدا کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر سید صاحب پوری آیت لکھ دیتے تو لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف قدرت نمائی مقصود ہے اس لئے انہوں نے آیت کے سرے کو حذف کر کے **فانا خلقنا من تراب** سے نقل کیا حالانکہ ابتداء آیت یہ ہے

وان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنا کم من تراب ثم من نطفة یعنی اگر تمہیں قیامت میں شک ہوتو دیکھ لو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پھر نطفہ اور علقہ وغیرہ سے پیدا کیا، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ قیامت میں تمہیں دوبارہ پیدا کرنا کوئی بڑی بات نہیں، اگر یہاں قانون فطرت کا حال بیان کرنا مقصود ہوتا تو ارشاد ہوتا کہ ہم نے تمہاری فطرت کا یہ قانون مرتب کیا ہے کہ نطفہ اور علقہ وغیرہ سے پیدا کیا کرتے ہیں اگر کوئی تم سے کہہ دے کہ قیامت ہوگی اور تم دوبارہ پیدا ہو گے تو اس کی تصدیق مت کرو کیونکہ مردوں کو دوبارہ پیدا کرنے کے لئے قیامت کے دن نہ جوڑوں کا وجود ہوگا نہ نطفے کا اب غور کیجئے کہ سید صاحب نے جو مضمون بیان کیا ہے اس کو قرآن سے کیا تعلق ہے۔ اس کے بعد وہ آیت شریفہ **وآیہ لھم اللیل نسلخ منہ النھار فاذا ھم مظلمون**

والشمس لسمتقر تجری لها ذلک تقدیر العزیز العلیم وغیرہ آیات متعلقہ شمس وقمر نقل کر کے لکھتے ہیں: پس یہ نہیں ہوسکتا کہ سورج خلاف فطرت جس طرح کہ وہ چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے کسی کے لئے چلنے سے ٹھہر جائے، اور جب کہ یہ ثابت ہوگیا کہ سورج کا چلنا زمین کی حرکت سے دکھائی دیتا ہے تو اسی آیت سے لازم آتا ہے کہ: یہ نہیں ہوسکتا کہ زمین حرکت کرنے سے کسی وقت کسی کے واسطے ٹھہرا جائے، ایسا ہونا خلاف فطرت کے ہے اور وہ ایسا ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدے کے برخلاف ہونا ناممکن ہے۔ ان آیتوں میں صرف اتنی خبر مقصود ہے کہ شمس وقمر کا چلنا تقدیر الٰہی سے ہے، ممکن نہیں کہ اتنے بڑے اجسام خود بخود حرکت کریں۔ ان میں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کسی کے لئے ٹھہر نہیں سکتے اور نہ یہ کہ زمین حرکت سے ٹھہر نہیں سکتی!! یہ سب فرضی باتیں ہیں خدائے تعالیٰ کے کلام کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔ سید صاحب پر حکمت جدیدہ کی تصدیق نے ایسا غلبہ کیا کہ قرآن کو ماننا تو درکنار جو جی چاہا خود مختاری سے اس میں بڑھا دیا اور اس کے کچھ پروانہ کی کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے **فویل الذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عنداللہ**۔ دیکھئے "تجری لمتسقر لہا" کہ معنے لکھتے ہیں کہ سورج چلتا دکھائی دیتا ہے! حالانکہ حق تعالیٰ

صاف لفظوں میں فرمارہا ہے کہ وہ جاری ہوتا ہے یعنی دوڑتا ہے ،سید صاحب جو لکھتے ہیں کہ ثابت ہوگیا کہ سورج کا چلنا زمین کی حرکت سے دیکھائی دیتا ہے! سو وہ بے اصل محض ہے اس لئے کہ دراصل نہ سورج کی حرمت محسوس ہے نہ زمین کی حرکت ، اگر محسوس ہے تو اوضاع کا بدلنا کہ طلوع ،استواء اور غروب کے اوقات میں سورج مختلف اوضاع پر دکھائی دیتا ہے ،اور سورج اپنی جگہ قائم ہے ،یا سورج کو حرکت ہے اور زمین کو حرکت ہے اور زمین ساکن ہے دونوں صورتوں میں سورج کے اوضاع مختلف نظر آئیں گے ،اب اگر حکیموں کے قول پر ایمان لایا جائے تو زمین کی حرکت اور جریان ثابت ہوگا۔ سید صاحب حکیموں کی تصدیق کر کے آفتاب کے جریان او رحرکت کو نہیں مانتے اہل ایمان قولہ تعالیٰ ’’والشمس تجری ‘‘ پر ایمان لاتے ہیں ،اب ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں کہ خدائے تعالی کی تصدیق کرنا مسلمان کا کام یا تکذیب کر کے لفظ تجری کے سورج چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے حالانکہ سورج کا چلتا دکھائی دینا بھی غلط ہے اس لئے محسوس صرف سورج کے مختلف اوضاع ہیں جس کا سبب قرآن شریف سے معلوم ہوا کہ سورج خود متحرک ہے ۔سید صاحب اسی میں لکھتے ہیں کہ: پھر خدا نے ابراہیمؑ کی زبان سے یہ قانون بتلایا فان اللہ

یاتی بالشمس من المشرق فات بها من المغرب فبهت الذی کفر پس یہ بات غیر ممکن ہے کہ جب تک یہ قانون فطرت قائم ہے سورج مغرب سے طلوع ہواور اسی کے ساتھ یہ بھی ناممکن ہے کہ زمین مغرب سے مشرق کی طرف اپنے محور پر گردش نہ کرے اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدے کے برخلاف ہونا ناممکن ہے ۔اصل واقعہ یہ ہے کہ نمرود خدائی کا دعویٰ کرتا تھا ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ خدامیں ایسی قدرت کہ ہے کہ جو چاہئے کرسکے گوخلاف عادت ہو، اگر تو خداہے تو آفتاب کومغرب کی طرف سے طلوع کر! یہ سن کروہ مبہوت ہوگیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ خوارق عادات ظاہر کرنا خدا ہی کا کام ہے ،جیسے تمام انبیاء ؑمعجزوں کی نسبت کیا کرتے تھے۔ ہر چند ابرہیم علیہ السلام پر آتش نمرود کا گلزار ہوجانا ان کا معجزہ تھا مگر انہوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے اپنی ذاتی قدرت سے یہ کام کیا !اگر قانون قدرت کے خلاف خرق عادت ممکن نہ ہوتی تو ابرہیم علیہ السلام مقابلے کے وقت نہ خرق عادت طلب کرتے ،نہ آگ ان پر سرد ہوتی ۔سید صاحب گو اس معجزے کے بھی قائل نہیں مگر جب بتواتر ہم تک پہنچا ہے اور کروڑہا مسلمان اس کے قائل ہیں اور کھلے لفظوں میں قرآن شریف اس پر شہادت

دے رہا ہے تو ہمیں سید صاحب کی بات ماننے کی کیا ضرورت۔اور لکھتے ہیں کہ: ایک جگہ ابراہیمؑ کے قصے میں فرمایا ہے **فما کان جواب قومه الاان قالوا اقتلوه او حرقوه فانجاه الله من النار۔**"**فانجاه الله من النار**" سے ثابت ہوتا ہے کہ احراق خاصہ نار کا ہے،اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ خدائے تعالی نے اس سے ان کو نجات دی اس طرح کہ آگ سے فرمایا کہ ان پر سرد ہو جا کما قال اللہ تعالیٰ **قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی ابراهیم** اس سے ثابت ہوگیا کہ آگ کے خاصے کو اپنی قدرت سے باطل بھی کر دیا۔سید صاحب نے تحریر میں عادتی امور مثل احراق نار وغیرہ سے متعلق آیتوں کو پیش کر کے لکھا ہے کہ: جو کچھ ہم نے قرآن مجید کی آیتوں سے قانون فطرت بتایا ہے اس پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قانون فطرت عام نہیں بلکہ اس میں مستثنیات بھی ہیں لیکن اس کے ذمہ مستثنیات کا قرآن مجید سے ثابت کرنا لازم ہوگا مگر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن مجید سے اس قانون فطرت میں مستثنیٰ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔شرح مواقف وغیرہ کتب میں مصرَّح ہے کہ معجزات کا وجود خبر متواتر سے ثابت ہے اور جو چیز تواتر سے ثابت ہے اس کا انکار نہیں ہوسکتا۔مگر سید صاحب اس تواتر کو جو مسلمانوں کے نزدیک ثابت ہے نہیں مانتے،اور ان ہی کی

خصوصیات نہیں کل مذاہب باطلہ کا یہی حال ہے ،اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی روایتوں سے وہ ناواقف ہیں۔غرض کوئی مانے یا نہ مانے کل مسلمانوں نے مان لیا ہے معجزات قانون فطرت عادیہ سے مستثنیٰ ہیں۔پھر جو آیتیں اہل اسلام کی طرف سے استدلال میں پیش ہوتی ہیں سید صاحب ان میں بے سروپا احتمالات قائم کرتے ہیں۔مثلاً ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں بالکل صراحت سے ہے قلنا یانار کونی برداً وسلاما علی ابراھیم یعنی ہم نے آگ سے کہا کہ ابراہیم پر سرد ہوجائے۔یہاں یہ خدشہ پیدا کرتے ہیں کہ: ابراہیمؑ کے قصے میں کوئی نص صریح اس بات پر نہیں کہ درحقیقت اس کو آگ میں ڈالا گیا۔اور یہ خیال نہیں کرتے کہ خدائے تعالی نے پہلے خبر دے دی ہے کہ کفار کے مشورے میں یہ بات طئے ہوگئی تھی کہ ابراہیم قتل کئے جائیں یا آگ میں ڈالے جائیں،جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے قالو اقتلوہ او حرقوہ اس کے بعد کے واقعے کی خبر دی کے ہم نے آگ کو حکم کیا کہ ابراہیم پر سرد ہوجا کما قال اللہ تعالی قلنا یانار کونی بردا سلاما علی ابراھیم اور یہ بھی فرمایا فانجاہ اللہ من النار یعنی ہم نے ان کو آگ سے نجات دی۔کیا ان تصریحات کے بعد بھی یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ وہ آگ میں نہیں ڈالے گئے

؟اگر واقعہ یہی تھا تو اس کی خبریں دی جاتی کہ: وہ آگ میں نہیں ڈالے گئے! پھر اس صورت میں آگ کو سرد کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ خدائے تعالی کی شان سے بعید ہے کہ ایسا فضول کام کرے اور اس کی خبر قرآن میں دے، اگر ایسے قوی قرائن کے بعد بھی کسی کی عقل ایک چھوٹے سے محذوف جملے کی طرف توجہ نہ کرے تو اس سے رموز واسرار قرآنی سمجھنے کی کیا توقع۔ بہر حال قانون فطرت کے مستثنیات قرآن وحدیث اور تواتر سے بکثرت ثابت ہیں، اگرچہ حکمائے یورپ جن کی تقلید سید صاحب کرتے ہیں انہوں نے یقین کرلیا تھا کہ خوارق عادات کا وجود ممکن نہیں، مگر حکمت جدیدہ میں جن کو مہارت تامہ حاصل ہے اور علمی اور عملی روزافزوں ترقیات کرتے جاتے ہیں انہوں نے ان تجربوں سے مشاہدہ کروادیا کہ صدہا ہزارہا ایسے امور وجود میں آتے رہتے ہیں جو قانون فطرت سے مستثنیٰ ہیں۔غرض کہ قانون فطرت کے مستثنیات عقلاً اور نقلاً ہر طرح سے ثابت ہیں۔سید صاحب تفسیر کی جلد سوم صفحہ(۴۸) میں لکھتے ہیں: ہماری سمجھ میں کسی شخص میں معجزہ یا کرامت کے ہونے کا یقین کرنا ذات باری کی توحید فی الصفات پر ایمان کو ناقص اور ناکامل کردیتا ہے،اور اس کا ثبوت پیر پرست اور گور پرست کے حالات سے، جو اس

وقت بھی موجود ہیں اور صرف معجزہ وکرامت کے خیال نے ان کو پیر پستی اور گور پرستی کی رغبت دے دی ہے اور خدائے مطلق کے سواء دوسرے کی طرف ان کو رجوع کیا ہے اور منتیں ماننا اور نذر و نیاز چڑھانا اور ان کے نام کے نشانات بنانا اور جانوروں کو بھینٹ دینا سکھایا ہے، بخوبی حاصل ہے، سید صاحب نے جو معجزہ اور کرامت کو شرک فی الصفات قرار دیا اس کی یہ صورت ہوگی کہ نبی خدا کی طرح معجزہ پر بالذات قادر مانے جائیں گے! مگر وہ محل نزاع نہیں کیونکہ قائلین معجزات کا عقیدہ ہے کہ معجزہ خدا کی نشانی ہے جو نبی کی درخواست پر یا خود بخود حق تعالیٰ ایسے امور کو پیدا کرتا ہے جن کا صدور دوسروں سے ممکن نہیں، نبی کو نہ وہ خالق سمجھتے ہیں نہ قادر مطلق بلکہ ان کے عقیدہ میں معجزہ تو معجزہ معمولی افعال جو ہر شخص سے صادر ہوتے ہیں ان کا بھی خالق خدائے قادر مطلق ہی ہے گو مخلوق کے قصد وارادہ سے وہ صادر ہوتے ہوں۔ سید صاحب جو خیال کرتے ہیں کہ انبیاء سے صدور خوارق ہو تو نہ خالق وقادر ہو جائیں گے!! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولی افعال کے فاعل کو وہ خالق سمجھتے ہیں کیونکہ صدور فعل میں دونوں برابر ہیں!! اگر نبی صدور فعل کے لحاظ سے خالق مانا جائے تو کوئی بھی فاعل جس سے فعل صادر ہو وہ بھی خالق ہوگا!! حالانکہ جو چیز موجود

ہوتی ہے وہ خدائے تعالیٰ کے ارادہ اور حکم سے وجود میں آتی ہے، جیسا کہ حق تعالی فرماتا ہے انما قولنا لشیء اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون یعنی جس چیز کو ہم پیدا کرنے کا ارادہ کرتے ہیں خواہ ذوات ہوں یا افعال تو لفظ ''کــن ''یعنی ''ہوجا'' کہتے ہیں جس سے وہ موجود ہو جاتی ہے۔اب غور کیجئے کہ جن کے ہاتھ پر معجزے صادر ہوتے تھے جب وہ بہ آواز بلند خدا کا یہ کلام سناتے ہوں گے اور یہ کہتے ہوں گے کہ ''ہم بھی تم جیسے بشر ہیں لیکن خدا جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مختص کرتا ہے''کما قال اللہ تعالیٰ واللہ یختص برحمۃ من یشاء تو کیا شرک فی الصفات کا احتمال بھی ہوگا؟ سید صاحب سائینس کے ایسے دل دادہ اور اس کے آگے حواس باختہ ہیں کہ اس کے مقابلہ میں خدا کے کلام کو بھی نہیں مانتے اور اس کو کھینچ کھانچ کر سائینس کے مطابق بنالیتے ہیں ،اور سائینس کا حال مولوی مہدی علی خاں محسن الملک نے لکھا ہے اور جس کو سید صاحب نے ''تحریر'' میں نقل کیا ہے کہ :ماڈرن سائینس (علوم جدیدہ) نے فتویٰ دے دیا ہے کہ خدا وجودِ معطل ہے،رزاقی اور الوہیت یہودہ خیالات ہیں، دعا اور عبادت وحشیوں اور جاہلوں کے ڈر اور خوف کا نتیجہ ہے،نبوت دھوکے کی ٹٹی ہے وحی افسانہ ہے الہام خواب ہے،روح

فانی ہے، قیامت ڈھکوسلہ ہے، عذاب وثواب انسانی اوہام ہیں، دوزخ اور جنت الفاظ بے معنی ہیں، انسان صرف ایک ترقی یافتہ بندر ہے مابعد الموت نہ سزا ہے نہ جزا ہے !! سید صاحب اس قسم کی کوئی بات صاف صاف تو نہیں کہہ سکتے، اس وجہ سے کہ اگر علانیہ ان امور کے قائل ہو جائیں تو مسلمان دام میں نہ آئیں گے، مگر ہر بات میں ایک نیا طریقے نکالتے ہیں مثلاً نبی کو مانتے تو ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ایک قسم کا دیوانہ شخص ہوتا ہے جو مثل دیوانوں کے بے اصل چیزوں کو دیکھتا اور سنتا ہے۔ اب کہئے کہ کون ایسا دیوانہ ہوگا جو کسی دیوانے کی تصدیق کرے اور اس کو اپنا مقتدا بنالے؟ اس طرح قرآن کو کلام الٰہی مانتے ہیں مگر کس طرح کہ نبی مذکور یعنی دیوانہ کے دل میں جو خدا کی طرف سے القاء ہوتا ہے وہی قرآن ہے جس کھلے لفظوں میں کہا جائے تو قرآن سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ ایک قسم کے دیوانے کے پریشان خیالات کا مجموعہ ہے نعوذ باللہ من ذلک ! جبھی تو یہ جرات ہوئی کہ جس طرح بن پڑے سائینس کے مطابق اس کو بنا لیتے ہیں تا کہ عقل مند کا کلام بن جائے کہ جو عادت جاری اور قانون فطرت ٹھہرا ہوا ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا ، دیکھئے خدا کی قدرت میں سب کچھ دے دیا مگر ہوگا وہی جو اسباب کے

قبضہ میں ہے کسی کا شعر ہے:

ازفرشِ خانہ تا بہ لب بام از انِ من

وزبامِ خانہ تا ثریا از انِ تو

سبحان اللہ معجزات وکرامات کے مسئلہ میں تو اس قدر احتیاط کہ اگر وہ مانے جائیں تو شرک فی الصفات ہوگا، اور ثابت کیا جارہا ہے کہ علل و اسباب پر عالم کا کام چل رہا ہے! خدائے تعالیٰ نے اپنے خاص خاص بندوں کو معجزات وکرامات جو دیے اس سے اسباب پرستی بہت کم ہوگئی تھی اور لوگ مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرتے تھے، مگر سید صاحب کو وہ ناگوار ہوا اور پھر اسباب پرستی پر لوگوں کو لگا دیا۔شبلی نعمانی صاحب نے ''الکلام'' میں لکھا ہے کہ: اب فرض کرو کہ ایک مدعی نبوت کسی خرق عادت کا اظہار کرتا ہے تو یہ کیونکر اطمینان ہوسکتا ہے کہ در پردہ کسی جن کا فعل نہیں ہے۔اس میں شک نہیں کہ جادو جو در پردہ شیاطین جن کے افعال ہیں اور معجزہ دونوں خرق عادت ہیں اسی وجہ سے اور کفار معجزہ دونوں خرق عادات ہیں، اسی وجہ سے کفار معجزہ کو سحر ہی کہا کرتے تھے جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے، مگر عادت اللہ جاری ہے یا یوں کہئے کہ فطرت انسانی میں داخل ہے کہ جب آدمی معجزہ دیکھتا ہے تو وہ پہچان جاتا ہے کہ وہ معجزہ من

جانب اللہ ہے اور جس سے وہ صادر ہوا وہ خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے، اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ بکری نے بھیڑیے کو گو کبھی نہ دیکھا ہو مگر جب دیکھے گی اس کو یقین ہو جائے گا کہ وہ اس کا دشمن ہے۔ کل فطرتی امور کا یہی حال ہے جس کی صدہا بلکہ ہزارہا نظریں انسان اور حیوانات میں موجود ہیں۔ ہمارے اس دعوے کی دلیل یہ آیت شریفہ ہے **فلما جاء تھم آیاتنا مبصرۃ قالوا ھذا سحر مبین وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم** جس کا مطلب یہ ہے کہ ''انبیاء کے معجزے دیکھتے ہی کفار کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ خدا کی طرف سے نبوت کی نشانیاں ہیں مگر ہٹ دھرمی سے انکار کر کے کہتے تھے کہ وہ سحر ہے۔ دیکھئے جب خدا نے خبر دی کہ منکروں کو معجزات کا یقین ہو جاتا تھا حالانکہ بظاہر ان کو سحر کہا کرتے تھے تو یقیناً ثابت ہوا کہ اندرونی فطرتی تعلیم تھی، اس کے بعد اس میں کلام کرنا ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ کیونکر اطمینان ہو سکتا ہے کہ بکری نے ابتداءً دیکھتے ہی بھیڑیے کو بھڑیا اور اپنا دشمن سمجھا حالانکہ کتّا بھی اس کا مشابہ ہے!۔ شبلی صاحب نے الکلام میں شرح مواقف کی یہ عبارت نقل کی ہے'' **وھی عند الاشاعرۃ اجری اللہ عادۃ بخلق العلم بالصدق عقبہ** ''یعنی اشاعرہ کہتے ہیں کہ عادۃ اللہ جاری ہے کہ معجزہ دیکھنے کے بعد علم ہو جاتا

ہے۔ پھر اس پر اعتراض کیا کہ، یہ دعویٰ بھی کل طور پر نہیں کیا جا سکتا ورنہ بداہت کی تکذیب لازم آئے گی، علانیہ ثابت ہے کہ انبیاء کے معجزات کے ظہور کے وقت ہزاروں آدمی ایمان نہیں لاتے تھے، بلکہ ایمان نہ لانے والوں کی تعداد ہمیشہ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہوتی تھی ۔ اس اعتراض کا جواب تقریر بالا سے واضح ہے کہ ایمان لانا اور چیز ہے اور یقین ہوجانا اور ہے سوفسطائی کو جلتے وقت آگ کے جلانے کا یقین ہوجاتا ہے مگر ہٹ دھرمی سے اس کی واقعیت کا انکار ہی کئے جاتا ہے، چونکہ ایمان کے لئے علاوہ یقین کے یہ بھی شرط ہیکہ جحود وانکار نہ ہو جیسا کہ ہم نے بحث ایمان میں اس کو ثابت کیا ہے اس لئے اہل جحود کافر ہی سمجھے جاتے تھے اور اس یقین سے ان کو کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ اور زیادہ مستحق عقوبت ہوئے۔ غرض کہ کفار کو معجزہ دیکھ کر نبوت کا یقین ہوجاتا تھا مگر ہٹ دھرمی سے انکار کرتے اور ایمان نہ لاتے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے فلما جاءتھم آیاتنا مبصرۃ یعنی ہماری نشانیاں دیکھ کر انہیں یقین ہوگیا تھا، ان نشانیوں کا ذکر کسی قدر تفصیل ہے اس آیت میں ہے وقالوا مھما تاتنا بہ من آیۃ لتسحرنا بھا فما نحن لک بمؤ منین فارسلنا علیھم الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم آیات مفصلات

فاستکبروا و کانوا قوماً مجرمین یعنی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم کتنی ہی نشانیاں ہمارے پاس لاؤ تا کہ ان سے ہم پر جادو کرو مگر ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے۔ پس بھیجا ہم ان پر طوفان اور رٹڈیاں اور پسو اور مینڈک اور خون کی نشانیاں جدا جدا، پھر انہوں نے سرکشی کی اور وہ قوم تھی گناہگار۔ سید صاحب اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: پسو وغیرہ کا پیدا ہونا کوئی غیر معمولی اور مافوق الفطرۃ بات نہ تھی، رہا خون سو وہ دراصل خون نہ تھا، بلکہ نیل کے پانی کا رنگ طغیانی کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ یہ سید صاحب کا خیال ہے مگر حق تعالیٰ نے تو ان کو آیاتنا مبصرۃ فرمایا ہے یعنی اپنی قدرت کی روشن نشانیاں، اگر وہ سب معمولی باتیں ہوتیں تو ہر شخص موسیٰ علیہ السلام سے کہتا کہ حضرت یہ کیاں نشانیاں آپ لائے یہ سب باتیں تو ہمیشہ ہوا ہی کرتی ہیں!! اگر ان ہی چیزوں کا نام نشانی ہے تو ہم بھی خدا کی نشانی ہیں مگر آپ کو اس سے کیا نفع!! غرض کہ وہ معمولی باتیں نہ تھیں کیونکہ منکرین نے اس کو سحر کہا جو خلاف قیاس خارق عادت ہوا کرتا ہے اور خدائے تعالی نے اپنی نشانیوں کی نسبت فرمایا **وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم** یعنی انہوں نے انکار تو کیا مگر ان کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ قدرت کی نشانیاں ہیں۔

سید صاحب نے تفسیر سورہء انعام میں لکھا ہے: جو گروہ کسی شخص کو دین وشریعت کا ہادی سمجھتا ہے اسکی بزرگی اور تقدس کا اعتقاد بھی اعلیٰ درجہ پر رکھتا ہے جس کا نتیجہ موافق فطرت انسانی یہ ہوتا ہے کہ انسانوں سے اس کو برتر حاصل ہو، معمولی تسلیم کئے جاتے ہیں جن سے بنی نوع انسانی سے اسکو برتری حاصل ہو معمولی واقعات اور حادثات جو قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں جب اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو اس کی کرامتیں اور معجزے قرار پاتی ہیں۔ یہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ جب فطرت انسانی میں داخل ہے کہ دین وشریعت کے ہادی کو دوسرے انسانوں سے برتر رتبہ دیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ مثل اور مقتضیات کے اس فطرت کا مقتضیٰ صحیح نہ سمجھا جائے، جہاں تک دیکھا جاتا ہے فطری امور میں غلطی نہیں ہوتی، دیکھئے بکری فطرتی طور پر بھیڑیے کو اپنا دشمن سمجھتی ہے اور فی الواقع دشمنی اس میں موجود بھی ہوتی ہے اسی طرح فطری طور پر انسان انبیاء میں خوارق عادات کو تجویز کرتا ہے اس کی صحت بھی ضروری ہے ورنہ فطری امور غلطی لازم آئے گی جو خلاف واقعہ بلکہ خلاف بداہت ہے، پھر اس کی تصدیق بھی قرآن شریف سے ہو رہی ہے کہ ہر نبی کو نشانیاں اور معجزات دیے گئے اس کے بعد یہ خیال کیونکر صحیح ہوسکتا کہ لوگ خوش اعتقادی سے معمولی کاموں کو

بھی معجزے سمجھ لیتے تھے!! ادنی تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ خوش اعتقادکیسی وہاں تو لوگ انبیاء کے جانی دشمن تھے جن امور کا معجزے ہونا قرآن شریف ہے ان کو وہ سحر کہا کرتے تھے، بھلا ایسے لوگوں سے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ معمولی کاموں کو معجزے کہیں ،مگر حقانیت کیا بیکار جاسکتی ہے، آخر معجزے اپنا پورا اثر قوم کے دلوں میں کرہی دیتے جس سے اہل حق کی جماعت ممتاز ہوجاتی، اور ایک جماعت باوجود یقین کے شومی قسمت سے انکار کرکے انبیاء علیہم السلام کے فیوض سے محروم رہتی ہے کما قال اللہ تعالیٰ وجحدوا بھا واستیقنتھا انفسھم سید صاحب تفسیر سورہ انعام میں لکھتے ہیں کہ :معمولی اتفاقی واقعات جیسے بددعا سے بجلی گرتی تھی معجزے اور کرامات سمجھے جاتے ہیں یا مجاہدات سے جو انسانی قوتیں بڑھ جاتی ہیں ان سے ایسے ایسے امور صادر ہوتے ہیں جو عام لوگوں سے نہیں صادر ہوتے مقدس لوگوں کی طرف منسوب ہونے سے معجزے سمجھے جاتے ہیں، اور بہت سی ایسی باتیں بھی ان کی طرف منسوب ہوجاتی ہیں جن کا اصل نہیں ہوتا ان غلط خیالات کے سبب سے لوگوں نے انبیاء علھیم السلام سے انکار کیا ہے چنانچہ قوم نوح قوم عاد،قوم ثمود نے انبیاء سے انکار کرنے کی یہی وجہ بیان کی ہے کہ ان انتم الا بشر مثلنا۔اس کا

مطلب یہ ہوا کہ کافروں نے انبیاء کی نبوت کا جو انکار کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کے غلط خیالات ان کی نسبت مشہور ہو گئے تھے کہ وہ معجزے دکھاتے ہیں یا انہوں نے اس کا دعویٰ کیا تھا، اس وجہ سے کفار نے کہا کہ تم بھی ہم جیسے بشر ہو۔ سید صاحب اگر پوری آیت پڑھتے تو کبھی یہ بات نہ کہتے، پوری آیت یہ ہے **قالوا ان انتم الا بشر مثلنا تریدون ان تصدونا عما کان یعبد آباؤ فاتونا بسلطان مبین** یعنی کفار نے کہا تم بھی ہم جیسے بشر ہو، چاہتے ہو کہ ہمارے باپ دادا جن چیزوں کی پرستش کرتے تھے ان کی پرستش سے ہمیں روک دو، اگر کوئی بات تم میں ہم سے زیادہ ہے یعنی خدا کے رسول ہو تو کوئی کھلی دلیل اس کی پیش کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے جو انہیں بتوں کی پرستش سے روکا تھا اس پر برہم ہو کر بولے کہ تمہیں روکنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ تم بھی ہم جیسے بشر ہو، اگر خدا کی طرف سے یہ حکم لائے ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ!! ان کا معجزہ طلب کرنا بمقتضائے فطرت انسانی تھا، اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام نے معجزے دکھائے اور قوم مشرف باسلام ہوئی اور بعض بدقسمتی سے محروم رہے۔ دیکھئے **ان انتم الا بشر مثلنا** کس موقعہ میں کہا گیا تو اور سید صاحب اس کو کہاں لے جا رہے ہیں؟ رہا یہ کہ بجلی گرنی مثلاً ایک معمولی

بات ہے مگر وہی بات کبھی کرامت کے رنگ میں ظہور کرتی ہے چنانچہ یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب بادشاہ وقت کسی مہم سے فارغ ہو کر دہلی پہنچا تو اکابر وعلماء مشائخین اس کے استقبال کے لئے گئے مگر حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز تشریف نہیں لے گئے ،حاسدوں کو موقع ملا کہ بادشاہ کو ان سے بدظن کردیں، بادشاہ نے حاکمانہ آپ کو بلوایا،تب بھی آپ نہ گئے اور فرمایا'' ہنوز دلی دور است'' چنانچہ یہی مقولہ اب تک زبان زد خلائق ہے۔غرض کہ آپ کی دل شکنی کا یہ اثر ہوا کہ بجلی گری اور بادشاہ کو جلا کر خاک سیاہ کردیا،اس وقت آپ نے فرمایا

اے روبہک چرا نشستی بجائے خویش

باشیر پنجہ کردی ودیدی سزائے خویش

کیا ان تمام قرائن کے بعد بھی یہی خیال کیا جائے گا کہ وہاں بجلی کا گرنا ایک معمولی بات تھی ،اس موقعہ پر بھی اگر معتقدوں کو کرامت کا احساس نہ ہو تو ان سے بڑھ کر کوئی بدقسمت نہیں۔شبلی صاحب'' الکلام''میں لکھتے ہیں : اشاعرہ کی شترگربکی حقیقت میں نہایت تعجب انگیز ہوتی ہے، وہ جب کسی خرق عادت کے ثبوت کا دعویٰ کرتے ہیں تو صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ واقعہ ممکن ہے:اور امکان کو اس قدر وسعت دیتے ہیں کہ ہر قسم کے

مستبعدات گو وہ ازل سے آج تک کبھی وقوع میں نہ آئے ہوں اس میں شامل ہوجاتے ہیں، لیکن دوسری ہی طرف یہ خیال نہیں کرتے کہ واقعہ کے لئے جس قسم کا امکان وہ ثابت کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ راویوں کا غلطی کرنا ممکن ہے،اس لئے اگرصرف امکان پر مدار ہوگا تو ایک شخص وہ پہلو کیوں نہ اختیار کرے گا جو زیادہ ممکن اور قریب الوقوع ہے۔بات یہ ہے کہ اشاعرہ کو خدا کی قدرت پر پورا ایمان تھا،انہیں اس امر کا یقین تھا کہ جس چیز کو خدائے تعالیٰ موجود کرنا چاہتا ہے اس کو لفظ ''کن'' سے موجود کردیتا ہے، کما قال اللہ تعالیٰ انما قولنا لشیء اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون یعنی جب ہم کسی چیز کو موجود کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سواء کچھ نہیں کرتے اس کو موجود ہوجا کہتے ہیں تو وہ موجود ہوجاتی ہے۔جس سے ظاہر ہے ک علل اسباب سب برائے نام ہیں اصل سبب تو وہی قول ''کن'' ہے،مگر اس کے سواء بھی اگر کسی سبب کی ضرورت ہو تو وہ خود ہی مسبب الاسباب ہے۔رہی عادت تو وہ کسی چیز کی علت وسبب ہے نہ شرط وغیرہ۔اب دیکھئے کہ ان کو اس ایمان کے بعد معجزات کی تصدیق کرنے میں کونسی چیز مانع ہے؟ان کے نزدیک شق القمر اور شق حجر کو خدا کی قدرت کے ساتھ ایک قسم کی نسبت ہے،اس وجہ سے جس طرح ان کو معمولی باتوں کی تصدیق ایک

دو مستند راویوں کی خبر سے ہو جاتی ہے اسی طرح خوارق عادات کی تصدیق بھی ہو جاتی تھی ، بلکہ معمولی خبروں سے زیادہ ان کی تصدیق کی ضرورت سمجھتے تھے اس لئے کہ قرآن شریف میں جا بجا مذکور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیے گئے تھے ،اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو افضل الانبیاء ہیں ،آپ کی فضیلت معجزات کے اعتبار سے بھی ثابت ہونے کی ضرورت تھی اور یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ آپ کے معجزات کثرت سے ہوں اور ان کی کیفیات بھی ایسی انوکھی ہوں کہ جن کا کبھی وقوع نہ ہوا ہو اور اگر کوئی ایسی نشانی اور معجزہ کہ ازل سے اس وقت تک کبھی وقوع پذیر نہ ہوا ہو تو اس کا کیا کہنا وہ تو اعلیٰ درجے کا مفید مدعیٰ تھا بہر حال تکمیل ایمان کے لحاظ سے بھی ان کو سخت حیرت انگیز معجزوں پر ایمان لانے کی ضرورت تھی بلکہ ان کی فطرت ایمانی ان کو ایمان پر مجبور کرتی تھی ۔غرض کہ ایمان دار وہ پہلو اختیار کرتے ہیں جو اشاعرہ نے اختیار کیا، اور دوسرے لوگ وہ پہلو اختیار کرتے ہیں جس سے کوئی معجزہ ثابت نہ ہونے پائے اور قرآن کے تمام واقعات جو معجزات سے متعلق ہیں سب (نعوذ باللہ) لغو ٹھہر جائیں اور ان کی اصلاح اور تاویل کی ضرورت ہو۔ سید صاحب تحریر میں لکھتے ہیں کہ: جن آیتوں سے معجزات مافوق الفطرت

ثابت ہوتے ہیں ان کے کوئی اور معنی بھی ایسے ہیں جو موافق زبان وکلام کے اور موافق محاورات اور استعمالات اور استعارات قرآن مجید کے ہوسکتے ہیں، اگر نہ ہوسکتے ہوں تو ہم قبول کرلیں گے کہ آپ اس بات کو ثابت نہیں کر سکے کہ قرآن مجید میں معجزات مافوق الفطرت موجود ہیں ،اس لئے ہم استعارات ومحارات وغیرہ لے کر ان کو فطرت کے موافق بنادیں گے۔ سرسید صاحب نے اگرچیکہ نہایت مسلمانوں کی ہمدردی کر کے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہو کہ تمام آیتوں کو فلسفہ کے مطابق بنادیں گے اس لئے فلسفہ کا سیلاب آنے والا ہے، مگر اس کی مثال بعینہٖ ایسی تھی ایک عقل مند صاحب کدال پھاوڑا لے کر ایک شخص کے گھر پر جا پہنچے اور لگے اس کو کھودنے صاحب مکان نے کہا حضرت خیر تو ہے؟ کہا خیر کیسی، قریب میں ایک ایسا سیلاب آنے کو ہے کہ اس گھر کا پتہ بھی نہ رہے گا، کہا: حضرت اسوقت دیکھا جائے گا ابھی سے آپ خانہ ویرانی کی فکر کیوں فرماتے ہیں ؟ کہا میں چند دیواریں اور کمرے توڑ کر سیلاب نکل جانے کے راستے بنادیتا ہوں جس میں تمہاری سراسر خیر خواہی ہی متصور ہے!! غرض کہ وہ سادہ لوح چپ ہوا اور عقل مند صاحب نے ایسی ہمدردی کی کہ مکان کو مسمار اور اس سادہ لوح کو خانہ بدوش اور آوارہء دشت اِدبار کردیا۔ اسی

طرح سید صاحب نے بھی قرآن میں جو شکست وریخت کی قبل از وقت اور بے موقعہ تھی، اس لئے کہ جس سیلاب کا ان کو خوف تھا خود اہل حکمت جدیدہ نے اس کا رخ پھیر دیا۔ اب خوارق عادات کو نہ ماننے والے ذلیل وخوار ہورہے ہیں کہیں ان کا سہارا نہیں ملتا اور اسی سیلاب نے ان تمام اندوختہ سرمایوں اور دقیانوسی خیالوں پر پانی پھیر دیا اور ان کی ان بنیادوں ہی کو اکھاڑ پھینکا جن کو وہ مستحکم خیال کرتے تھے، جن میں وہ اصول تراشیدہ سید صاحب بھی دریابرد ہوگئے جو ''التحریر فی اصول التفسیر'' میں تھے۔ الحمدالله علی ذلک

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

اب ''مدعی سست گواہ چست'' کا مضمون صادق آرہا ہے کہ سائینس دان تو کچھ نہیں کہہ سکتے مگر سید صاحب کے ہم خیال پیچھا نہیں چھوڑتے اور اپنی تصنیفات کو چھاپ چھاپ کر بطور اعلان شائع کرتے رہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کا قرآن جس کو ہم لوگ آسمانی کتاب سمجھتے ہیں اس میں ایسی باتیں ہیں کہ تیرہ سو ۱۳ برس سے جو کروڑہا مسلمان سمجھتے اور درس گاہوں میں تعلیم دیتے آئے وہ سب غلط ہیں، اس لئے اب ہم اس کی اصلاح کرتے ہیں!! ہم نے مانا کہ اس اصلاح کے بعد ایک حکمت جدیدہ وہ بھی

کون سے جو دقیانوسی خیال والے سمجھے جاتے ہیں، قرآن کو اپنے خیالات کے مخالف نہ سمجھیں گے۔ مگر اس سے مسلمانوں کو کیا نفع؟ تمام حکماء اہل اسلام کی تضحیک کریں گے کہ ہم میں سے ایک جماعت نے جس کے علوم درجہ اعتبار تک بھی نہیں پہنچتے تھے مسلمانوں کو منوا کر چھوڑا جس سے ان کو اپنی کتاب میں معنوی تحریف کرنے کی ضرورت ہوئی۔ کیا مسلمانوں کی حمیت اس کو جائز رکھ سکتی ہے کہ اپنے قرآن اور دین کو منسوخ اور حکمت جدیدہ کے خیالات کو ناسخ قرار دیں!۔ سید صاحب نے قرآن کو تاویلیں کر کے ایسا بنا دیا جیسے یوذاسف نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کو بنایا تھا۔ ابوریحان خوارزمی نے الاثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ میں لکھا ہے کہ: یوذاسف جس نے بادشاہ طہمورث کے وقت میں ہندوستان میں آ کر نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور دراصل ستارہ پرست تھا، اس نے بیان کیا کہ ابراہیم علیہ السلام ستارہ پرست تھے اتفاقاً ان کے قلفہ میں برص نمودار ہوا اس زمانے میں برص والے کو نجس سمجھ کر اس سے مخالطت نہیں کرتے تھے، اس وجہ سے انہوں نے اپنے قلفہ کو قطع کر ڈالا جس کو لوگ ختنہ سمجھتے ہیں، پھر جب کسی بت خانہ میں وہ حسب عادت گئے، کسی بت سے آواز آئی کہ اے ابراہیم تم ایک عیب کی وجہ سے ہمارے پاس سے چلے گئے تھے

اوراب وہی عیب لے کر آئے ہو چلو ہمارے پاس سے نکلو اور پھر یہاں کبھی نہ آنا !! یہ سن کر ان کو غصہ آیا اور اس بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مذہب بھی چھوڑ دیا، اس کے بعد ان کو اپنے فعل پر ندامت ہوئی اور چاہا کہ اپنے بیٹے کو مشتری کے لئے ذبح کریں کیونکہ اس زمانہ میں دستور تھا کہ ایسے مواقع پر اپنی اولاد کو ذبح کیا کرتے تھے، جب مشتری کو ان کی سچی توبہ کی صداقت معلوم ہوگئی تو ایک دنبہ ان کے فرزند کے عوض میں دے دیا۔ دیکھئے کتب آسمانی میں ابرہیم علیہ السلام کا بتوں کو توڑنا اور فرزند کو ذبح کرنا اور ختنہ کرنا جو مذکور ہے جس کے قائل اکثر اہل ادیان ہیں سب کو اس نے بحال رکھا مگر تاویل اس قسم کی کہ بجائے نبوت کے بت پرست اور ستارہ پرست بنا دیا!! سرسید صاحب کی تفسیر بھی دیکھی جائے تو اسی قسم کی تاویلات سے مالا مال ہے، بطور نمونہ ہم ایک آیت کی تفسیر نقل کرتے ہیں، حق تعالیٰ فرماتا ہے **واذقال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویفسک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال انی اعلم مالا تعلمون وعلّم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملکۃ فقال انبوئی باسماء ھولاء ان کنتم صادقین قالوا**

سبحانک لاعلم لنا الاماعلمتنا انک انت العلیم الحکیم قال یا آدم انبھم باسمائھم فلما انبا ھم باسمائھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض واَعلم ماتبدون وما کنتم تکتمون واذقلنا للملائکۃ اسجدوالاٰدمفسجدودا الاابلیس ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین ۔ترجمہ: ذکرکروجب کہا تمہارے رب نے فرشتوں کو کہ مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب ،بولے کیا تو پیدا کرتا ہے اس میں ایسے شخص کو جوفساد کرے اس میں اور خو نریزی کرے،اورہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو،فرمایا مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے اورسکھائے آدم کو نام سارے پھروہ دکھائے فرشتوں کوکہا بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر ہوتم سچے!بولے تو سب سے نرالا ہے ہم کو وہی معلوم ہے جتنا تو نے سکھایا،توہی ہے اصل دانا حکمت والا ،کہا اے آدم بتا دوان کو نام اُن کے،پھر جب انہوں نے بتادیا نام ان کے کہا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ مجھ کو معلوم ہیں آسمانوں اورزمین کی پوشیدہ چیزیں،اورمعلوم ہے جو تم ظاہر کرو اورجو چھپاتے ہو۔اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو کہ آدم کو سجدہ کروتو گر پڑے وہ سجدے میں مگر ابلیس نے قبول نہ کیا اورتکبر کیا اور وہ تھا

منکروں میں۔ جو شخص عربی سمجھتا ہے اس آیت کا مطلب یہی سمجھے گا کہ خدائے تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرتے وقت بطور امتحان فرشتوں سے پوچھا کہ ہم ان کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے ہیں، فرشتوں نے بلحاظ قرآئن وآثار اپنا استحقاق بیان کیا مگر خدائے تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی توسیع علم دکھا کر ان کی فضلیت علمی اور استحقاق خلافت ثابت فرمایا جس کو فرشتوں نے بھی مان لیا۔ مگر سید صاحب پر چونکہ حکمت جدیدہ کا افسوں چل چکا تھا اور وہ زمانہ اس حکمت کے لڑکپن کا تھا، اور قاعدہ ہے کہ اوئل میں عقل اتنی تیز اور بالغ النظر نہیں ہوتی کہ محسوسات سے آگے بڑھ کر دوسرے عالم میں کچھ کام کرسکے، اس لئے سائینس دانوں کی دوڑ دھوپ صرف مادیات ہی تک محدود تھی ۔ سید صاحب نے بھی اسی بناء پر مسلمانوں کو اولڈ فیشن قرار دے کر ملائکہ اور جنات وغیرہ اشیائے غیر محسوسہ وغیرہ کا انکار ہی کر دیا۔ رہا یہ کہ خدائے تعالی نے کلام مجید میں ملائکہ وغیرہ کی خبر دی ہے سو اس میں تاویلیں کر ڈالیں چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”تمام مفسرین اس کو ایک واقعی جھگڑا سمجھتے ہیں جو خدا اور فرشتوں میں ہوا، تعالی شانہ عما یقولون ۔ عام مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے کہ فرشتوں کو ہوا کے مانند لطیف اجسام سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ

آسمانوں پر رہتے ہیں اور پر دار ہیں کہ اڑ کر زمین پر اترتے ہیں اور چیلوں کی طرح آسمان اور زمین کے بیچ میں منڈلاتے ہیں! میں کہتا ہوں کہ اس بات کا کیا ثبوت کہ ایسی خلقت ہے یا نہیں؟ جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہوسکتا، بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور ان کے قویٰ کو ملک یا ملائکہ سے تعبیر کیا ہے، جس میں ایک شیطان یا ابلیس بھی ہے۔ پہاڑوں کی صلابت پانی کی رقت، درختوں کی قوت نمو، برق کی قوت جذب و دفع، غرض کہ تمام قویٰ جن سے مخلوقات موجود ہیں وہی ملائکہ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، انسان مجموعہ قوائے ملکوتی اور قوائے بہیمی ہے، اور ان دونوں قوتوں کی بے انتہا ذریات ہیں جو ہر ایک قسم کی نیکی و بدی ہیں، اور وہی انسان کے فرشتے اور ان کے ذریات اور وہی انسان کے شیطان اور اس کی ذریات ہیں۔ امام محی الدین ابن عربی نے فصوص الحکم میں یہی مسلک اختیار کیا ہے، اور شیخ مؤید الدین جنیدی نے شرح فصوص میں فرشتوں کی نسبت بہت بڑی بحث لکھی ہے، شیخ رحمتہ اللہ علیہ اپنی اصطلاح میں تمام عالم مجموع من حیث المجموع کو انسان کبیر کہتے ہیں اور انسان کو انسان صغیر، مقصود ان کا اس اصطلاح سے یہ ہے کہ انسان عالم کا ایک فرد ہے اور جس قدر قویٰ انسان

میں ہیں وہ جزئیات ہیں اور جواس کی کلیات ہیں وہ انسان کبیر ہے، اور فرماتے ہیں کہ اس عالم یعنے انسان کبیر کے جوقویٰ ہیں ان ہی میں بعض کا نام ملائک ہے، شیخ رحمتہ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں کہ: وہ جن کو ملائکہ کہتے ہیں انسان کبیر یعنی عالم کے لئے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے قویٰ ہیں، اصل یہ ہے کہ ان آیتوں میں خدائے تعالی انسان کی فطرت کواوراس کے جذبات کو بتلاتا ہے اور جوقویٰ بہیمیہ اس میں ہیں ان کی برائی یاان کی دشمنی سے اس کو آگاہ کرتا ہے، مگر یہ نہایت دقیق راز تھااس لئے خدانے انسانی فطرت کی زبان حال سے آدم وشیطان کے یا خدااور فرشتوں کے مباحثہ کے طور پراس فطرت کو بیان کیا ہے، آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں جس کوعوام الناس اور مسجد کے ملا باوا آدم کہتے ہیں، بلکہ اس سے نوع انسانی مراد ہے اسماء کے معنی اکثر مفسرین وہ سمجھتے ہیں جس کو ہم نام کہتے ہیں جیسے گھوڑا، گدھا، کلو، نتھو، بلکہ فو قویٰ اس میں پیدا کئے ہیں اور جن کے سبب سے اس کا ذہن نشان یادلیل سے دوسری طرف منتقل ہوتا ہے اور نتیجہ پیدا کرتا ہے اسکواسماء کے لفظ سے بیان کیا ہے، اور چونکہ یہ قویٰ ایسے تھے جن سے انسان تمام چیزوں محسوسات ومقعو لات کو جان سکتا ہے اس لئے کلھا کے لفظ سے اس کی تاکید کی ہے، عرضھم کی ضمیر مفسرین نے اسماء

کے لفظ سے جو مسمیات سمجھ میں آتے ہیں اس طرف کو راجع کیا ہے مگر میرے نزدیک ہم کی ضمیر انسانوں کی طرف راجع ہے، گویا خدائے تعالیٰ نے تمام چیزوں کو جاننے کی قوت انسان میں ودیعت کر کے تنزلاً فرشتوں سے کہا کہ تم سب باتیں تو کیا بتاؤ گے انسان ہی میں جو کچھ ودیعت کیا گیا ہے اسی کو بتلاؤ؟ جب وہ عاجز آئے تو خدائے نے انسان سے کہہ کہ تو ان حقائق و معارف کو جو فرشتوں میں ہے بتلا دے۔

ملائکہ سے متعلق مباحث تو انشاء اللہ تعالیٰ کسی موقع پر لکھے جائیں گے یہاں صرف سید صاحب کی تحقیق کے مطابق مسلسل تفسیر لکھی جاتی ہے، تعمق نظر اور غور سے دیکھنے کے قابل ہے **واذقـــــال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ** ،فطرت انسانی کی زبان حال سے خدا نے قوت جاذبہ دافعہ، ہاضمہ، ماسکہ، غاذیہ، نامیہ اور بھوک ، پیاس اور سامعہ، باصرہ، حافظہ، متخیلہ اور ہڈیوں کی سختی اور گوشت اور چربی کی نرمی، اور خون و بلغم کی سیلانی، وغیرہ جو کل ملائکہ ہیں ان سے کہا: کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں **قالو اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء** انہوں نے کہا ’’تو فسادی اور خونریز کو خلیفہ بناتا ہے ‘‘۔اسکا جواب بہت آسان تھا ان سے کہہ دیا جاتا کہ انسان بیچارہ تو نہ فساد

کرسکتا ہے نہ خونریزی وہ سب تم ہی فرشتوں یعنے قوائے شہویہ اورغضبیہ کے کرتوت ہیں۔’’ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک‘‘ حالانکہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں۔ اگراس دعویٰ میں قوائے بہیمیہ بھی شریک تھیں تو کہا جاتا کہ تمہاری بھی عجیب حالت ہے اِدھر تسبیح وتقدیس بھی ہورہی ہے اور اُدھر فساد وخونریزی بھی جاری ہے پھر ایسوں سے خلافت کی کیا توقع ؟ اور اگر صرف قوائے ملکیہ ہی کا یہ دعویٰ ہے جس سے استحقاق خلافت جتایا جاتا ہے تو کہہ دیا جاتا کہ اچھا تم ہی خلیفہ سہی، اس وقت معلوم ہوجاتا کہ انسان سے علحدہ ہوکر کس طرح خلافت کرتی ہیں ! باوجود ایسا مسکت جواب موجود ہونے کے علمی امتحان کا قرار دینا کسی قدر شان کبریائی سے بعید ہے !! انی اعلم مالا تعلمون وعلم آدم الاسماء کلھا ‘‘ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور پیدا کریں آدم میں وہ قوتیں جن سے تمام نتائج نکالتا ہے ۔اور کلھا کا مطلب یہ ہے کہ تمام قویٰ ایسے ہیں جن سے انسان تمام چیزوں محسوسات ومعقولات کو جان سکتا ہے۔ تعلیم کے معنیٰ قوتوں کو پیدا کرنا اور کلھا سے تعمیم محسوسات ومعقولات یہ سید صاحب ہی کی تفسیر کے ساتھ مختص ہے، اس فیصلہ میں بھی ملائکہ ہی کی جیت رہی اس لئے کہ انہوں

نے صاف کہا کہ یہ قوتیں بھی تو ملکی ہی ہیں، پھر انسان کی فضلیت ہی کیا ہوئی اور کیوں مستحق خلافت ٹھہرا، **ثم عرضھم علی الملئکۃ فقال انبئونی باسماء ھولاء ان کنتم صادقین** ''پھر آدمیوں کوفرشتوں یعنے قوتوں کے سامنے کر کے کہا کہ تم اور تو کیا بتاؤ گے انسان ہی میں جو کچھ ودیعت رکھا گیا ہے اسی کو بتاؤ اگر سچے ہو۔ھولاء کا اشارہ اسماء سے قوتیں مرادلیں تو اسماء ھولائکے معنے قوتوں کی قوتیں ہوئے ،اب اگر یہ سمجھا جائے کہ قوتوں کے لئے قوتیں ہیں تو تسلسل ہوگا ،اور اگر نہیں ہیں تو اسماء کے معنے ناموں کے لینا پڑے گا جس سے سید صاحب راضی نہیں۔ **قالواسبحانک لا علم لنا الاماعلمتنا انک انت العلیم الحکیم** '' وہ فرشتے یعنی قوتیں عاجز آ گئیں اور لگے کہنے کہ ہمیں خبر نہیں ۔سید صاحب نے غور سے سنا نہیں ان قوتوں نے جواب دیا کہ جو جو قوتیں انسان میں ودیعت رکھی گئیں جن کی وجہ سے اس کی فضلیت ثابت ہو رہی ہے وہ بھی آخر ہماری ہی جنس کے فرشتے ہیں ان کی وجہ سے انسان کی فضلیت ہم پر کیونکر ثابت ہوسکتی ہے، وہ تو صرف مضغۂ گوشت ہے جس میں نہ نرمی شریک ہے نہ اور کسی قسم کی قوت ،بغیر ہماری دستگیری کے نہ وہ اپنی جگہ سے ہل سکتا نہ دیکھ سکتا ہے نہ بات کرسکتا ہے، پھر ایسے اندھے

، بہرے اپاہج اور بیوقوف کو خلیفہ اور ہمارا مخدوم بنانا کیونکر صحیح ہوگا۔ قال یا آدم انبئھم باسمائھم خدائے تعالیٰ نے انسان سے کہا کہ تو ان حقائق ومعارف کو جو فرشتوں میں ہے بتلا دے۔ فلما انباء ھم باسمائھم قال اء لم اقللکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض واعلم ماتبدون وما کنتم تکتمون یعنی جب انسان نے ان کے حقائق ومعارف کی خبر دی تو اللہ تعالیٰ نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں ظاہر و مخفی جانتا ہوں مگر اس کے ساتھ ہی فرشتوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ بیشک تو سب کچھ جانتا ہے مگر یہ مضغۂ گوشت انسان تو کچھ بھی نہیں جانتا حقائق ومعارف تو ہم بتلا رہے ہیں اور مفت میں خلافت کا وہ مستحق ہو رہا ہے۔ اس پر فرشتے جو داد فریاد اور غل مچا رہے ہیں معلوم نہیں سید صاحب نے کیوں نہیں سنا!! اور انصاف سے دیکھا جائے تو حق ان ہی کی جانب ہے اس لئے کہ ان فرشتوں کے مقابلہ میں انسان گویا لاشئ محض ہے ایک بات بھی نہیں کر سکتا کیونکہ بات کرنے میں بھی ایک فرشتے یعنی قوت ناطقہ کا محتاج ہے، پھر اس کو کیا ضرورت کہ اپنے جنس کے مقابلہ میں انسان کی دلیل بیان کرے؟ یہ ہے: سید صاحب کی تفسیر کا ماحصل!! انصاف سے کہا جائے کہ یہ قرآن کی تفسیر ہوئی یا توہین وتضحیک۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حق

تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس عالم کا آخری دور اور خاتمہ نہایت شان وشوکت کے ساتھ ہو، کہ ایک خلیفہ بھیجا جائے جس کی شرافت تمام عالم میں مسلم ہو، اور وہ ہر قسم کے کاموں میں ممتاز اور سر آمد روزگار بنا رہے۔اس کام کے لئے علم ازلی میں آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا انتخاب ہو چکا تھا مگر ظاہراً فرشتوں کی قدامت وخدمت اور تقرب وتقدس اس کے مقتضی تھے کہ وہ اس خدمت کے لئے اپنا استحقاق پیش کریں، اس لئے حق تعالیٰ نے ان سے تذکرہ فرمایا کہ میں ایک خلیفہ زمین پر مقرر کرنا چاہتا ہوں ،فرشتوں نے کہا،اعلیٰ درجہ کی صفت یعنے تسبیح وتقدس تو ہم میں موجود ہے پھر اگر ہم نہ مقرر کئے جایں تو کیا کوئی ایسا شخص مقرر کیا جائے گا جو فساد اور خونریزی کرے،حق تعالیٰ نے اتمام حجت کے لئے امتحان مقرر فرمایا چنانچہ آدم علیہ السلام اس میں کامیاب ہوئے اور فرشتے بھی قائل ہو گئے اور اس ’’خلیفۃ اللہ‘‘ کوسجدہ کیا۔اب کہئے کہ کیا یہ کوئی خلاف عقل بات تھی جس کا انکار کر کے سر سید صاحب نے قرآن مجید میں بدنما تاویلیں کیں ،اور مضمون کو ایسا خبط کر دیا کہ جو مضمون سید صاحب قرآن شریف سے نکالتے ہیں اگر کسی گنوار سے کہا جائے تو وہ بھی ایسے الفاظ میں اس میں مضمون کو ادا کرے گا قرآن شریف سے زیادہ واضع الدلالۃ ہوں گے۔اگر قرآن کا

بھی یہی مطلب قرار دیا جائے جو سید صاحب کہہ رہے ہیں تو مخالفین کو یہ کہنے کا بڑا موقع مل جائے گا کہ خدا اپنا مقصود بھی صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا! نعوذ باللہ من ذلک اس میں کلام نہیں کہ لفظ کے معنی مجازی بھی لئے جاتے ہیں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ جہاں جی چاہا مجازی معنے لے لئے، فن معانی وبیان میں مصرّح اور نیز عقل کی رو سے ثابت ہے کہ کسی لفظ میں کسی معنیٰ پر دلالت کرنے کی ذاتی صلاحیت نہیں جب تک کہ کسی معنی کے لئے وضع اور تخصیص نہ ہو، پھر اس کے بعد دوسرے معنی پر دلالت کرنے کی کوئی وجہ نہیں جب تک کہ کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو۔ مثلاً اگر کہا جائے کہ زید نے دیکھا اور کہا، تو ہر شخص اس سے یہی سمجھے گا کہ آنکھوں سے دیکھا اور زبان سے کہا، پھر اگر یہ بات معلوم ہو جائے کہ زید اندھا ہے اور گونگا ہے تو اس وقت بقرینہء حال ضرورۃً حقیقی معنیٰ چھوڑ کر مجازی معنیٰ لئے جائیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے ٹٹول کر معلوم کیا اور زبان حال یا اشارہ سے کہا۔ اس صورت میں آیت شریفہ **واذقال ربک للملائکۃ** کے حقیقی معنی ترک کر دینا نہ عقلاً جائز ہوسکتا ہے نہ نقلاً جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ ملائکہ کا مستقل وجود ممکن نہیں اور سید صاحب وجہ یہی بتاتے ہیں کہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ کوئی ایسی خلقت ہے۔ انصاف سے کہئے کہ

اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ خود خدائے تعالیٰ نے ان کے وجود کی خبر دی ہے۔ چند آدمی کسی چیز کے وجود کی خبر دیتے ہیں تو تواتر کی وجہ سے اس کا یقین ہوجاتا ہے، پھر ایسا کون شخص ہوگا جس کو خدا کی خبر دینے کا یقین نہ ہو؟ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ خدا ہی پر اس کو ایمان نہ ہو یا قرآن کو کلام الٰہی نہ سمجھتا ہو۔ اگر سید صاحب ملائکہ کے وجود کہ بہ دلائل محال ثابت کردیتے تو قرآن شریف میں تاویل کرنا چنداں بدنما نہ ہوتا، اور بغیر اس کے صرف اس لحاظ سے تاویل کرنا کہ کسی اور ذریعہ سے ملائکہ کا ثبوت نہیں ملتا اہل ایمان کی شان سے نہایت بعید ہے، اور ان کو کوئی حق نہیں کہ جو بات صراحتاً قرآن سے ثابت ہورہی ہے باوجود دعوائے ایمان کے اس میں تاویل کریں اور مرتکب مجاز ہوں۔ پھر طرفہ یہ کہ سرسید صاحب تحریر میں لکھتے ہیں کہ ''قرآن مجید میں تاویل کو مطابق اس کے مفہوم عام کے کفر سمجھتا ہوں''۔ غور کیجئے کہ آیت شریفہ کے معنے جو صراحتاً الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں وہ کیا ہیں اور سید صاحب نے اس کو کیا بنادیا؟ اس سے بڑھ کر اور کیا تاویل ہوگی! سید صاحب کے نزدیک ''تاویل'' کے کچھ اور معنی ہوں گے مگر وہ ایسے ہوں گے کہ ان کا مصداق کبھی نہ ملے گا، جس طرح ان کے نزدیک ''کفر'' کے معنی بھی ایسے ہی ہیں۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق

میں وہ لکھتے ہیں کہ جن لوگوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ خدا کے وجود کے بھی قائل نہیں ہیں، میں تو ان کو بھی مسلمان جانتا ہوں۔ جہاں سید صاحب نے لکھا تھا کہ ''تاویل کو کفر سمجھتا ہوں'' اس سے ان کی کمال درجہ کی احتیاط ثابت ہوتی ہے، جس سے ہر شخص سمجھ گیا ہوگا کہ سید صاحب تو متکلمین سے بھی زیادہ محتاط ہیں کیونکہ آخر انہوں نے ضرورۃً کہیں کہیں تاویلیں کیں ہیں مگر سید صاحب اس کو بھی کفر سمجھتے ہیں لیکن ان کی مراد اس تحریر سے معلوم ہوگئی کہ آیتوں میں تاویل کرنا یا ان کا انکار کرنا تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں، اگر خدا کے وجود کا بھی انکار کیا جائے تب بھی دین میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔ اب اس کے بعد سید صاحب اگر معجزات اور آیات قرآنیہ کے مضامین کا انکار کریں تو کوئی قابل مواخذہ بات نہیں۔ اس لئے کہ کسی دہریہ سے مثلاً کہا جائے کہ نماز کو خدا نے فرض کیا ہے، تو وہ یہی جواب دے گا کہ فرض چہ معنیٰ دارد؟ پہلے خدا کا وجود ثابت کیا جائے! غرض کہ نماز نہ پڑھنے کا مواخذہ اس سے اس عالم میں نہیں ہوسکتا۔ سرسید صاحب جو اپنے آپ کو اہل اسلام میں شریک فرماتے ہیں کمال تبرع ہے، جس کا شکر ادا کرنا چاہیئے، مگر اسی حد تک کہ مسلمانوں کی مردم شماری میں تعداد ان کے اور ان کے اتباع کے نفوس سے زیادہ ہورہی ہے۔ لیکن

اسلام کے اندرونی مسائل میں وہ یا ان کے ہم خیال کوئی محققانہ بحث
کریں تو اس کی وقعت کسی فیلسوف یا دہریہ کے قول سے زیادہ نہ ہو۔ اس
سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سید صاحب نے قرآن کی جو تفسیر لکھی ہے اس
سے ان کا مقصود قرآن کو رد کرنا ہے۔ سید صاحب معجزات کے وجود کا انکار
کرتے ہیں، حالانکہ حکمائے سابق نے بہ دلائل عقلیہ ان کو ثابت کیا ہے
، چنانچہ ''الشیخ الرئیس'' نے اشارات کے نمط تاسع میں لکھا ہے **والنبی متمیز باستحقاق الطاعة لاختصاصه بلایات تدل علی انها من عند ربه** یعنی کمالات ذاتیہ کی وجہ سے نبی کو استحقاق حاصل ہوتا ہے
کہ لوگ اس کی اطاعت کریں جس کی وجہ سے تمام عالم میں ممتاز ہوتا ہے
، اس لئے کہ جو نشانیاں اسکو دی جاتی ہیں وہ یقیناً دلالت کرتی ہیں کہ اللہ کی
طرف سے ہیں اور وہ نشانیاں اسی کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں کوئی دوسرا
وہ نشانیاں نہیں دکھلا سکتا۔ اور نیز شیخ نے اشارات کے نمط عاشر
میں لکھا ہے **ولا یستبعد ان یکون لبعض النفوس ملکة یتعدی تاثیرها بدنها او تکون لقوتها کانها نفس ما للعالم** یعنی عقل کی
رو سے یہ بعید نہیں کہ بعض نفوس کو ایسا ملکہ اور قوت حاصل ہو کہ بدن انسانی
سے متجاوز ہو کر دوسری اشیاء پر ان کا اثر بڑے، یا وہ نفوس کمال قوت کی وجہ

سے یہ درجہ رکھتے ہوں کہ گویا تمام عالم کے نفس ناطقہ ہیں اور اس میں تصرف کرتے ہیں۔ جیسے دوسرے نفوس اپنے ابدان متعلقہ میں تصرف کرتے ہیں ان کو حکماء کہتے ہیں کہ واقعات کا انکار نہ کرکے ان کے علل واسباب قائم کردیتے ہیں نہ یہ کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کا انکار کردیا! یہ طریقہ تو نہایت آسان ہے اس کو حکمت کی کیا ضرورت، ہر جاہل یہی کام کرتا ہے۔ علی احمد جرجاوی مصری ایڈیٹر ''اخبار الارشاد'' نے ''سفر نامہ جاپان'' میں لکھا ہے کہ میکاڈو شاہ جاپان نے تحقیق مذہب حق کے لئے تمام اہل یورپ سے درخواست کی کہ اپنے اپنے مذہب کے علماء کو روانہ کریں۔ چنانچہ فرانس، انگلستان، اٹلی، امریکہ، جرمن، اور ترک، کے ڈیلیگیٹ (نمائندے) جمع ہوئے اور ماہ مارچ سنہ ۱۹۰۶ عیسوی میں کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا، جس کے پریسیڈنٹ (صدر انجمن) خود شاہ مکاڈو تھے۔ دولت عثمانیہ کا ایک ڈیلیگیٹ کھڑا ہوا منجملہ اور تقریروں کے ان معجزات کو بیان کیا جو قرآن میں مذکور ہیں اور جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وقوع میں آئے۔ امریکن ڈیلیگیٹ نے معجزات کو تسلیم نہ کر کے ان میں تاویلیں کیں، مگر عثمانی ڈیلیگیٹ نے اس کے جوابات اس عمدگی سے دیے کہ اہل جاپان محظوظ ہوئے، چنانچہ اسلامی ڈیلیگیٹ کے

قابل قدر لکچر کی عام وخاص ہر ایک سوسائٹی میں دھوم اور ان کی تقریر کا عام چرچا تھا۔ لکھا ہے کہ اس جلسہ کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ پانچ ماہ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ ان لوگوں کے ہاتھ پر قریب بارہ ہزار افراد جاپانیوں کے مشرف باسلام ہوئے، اور اس کے نصف سے زیادہ یعنی چھ ہزار ہم لوگوں کے ہاتھوں پر تیس دن کے اندر داخل اسلام ہوئے۔ الغرض معجزات کو ماننے کی صلاحیت عقل میں نہ ہوتی تو عقلائے جاپان ان امور کے سننے پر دین اسلام کو ہرگز قبول نہ کرتے۔ غیرت کا مقام ہے کہ اسلام سے بیگانے تو معجزات کو سن کر ایمان لائیں، اور اس زمانے کی موروثی مسلمان معجزات کا انکار کر کے مسلمانوں سے علیحدہ ہو جائیں !! حق تعالیٰ اِس زمانے کے کُل مسلمانوں کو توفیق عطاء فرمائے کہ بغیر چون وچرا کے پورے قرآن وحدیث پر پورے طور سے ایمان لائیں۔

وَمَا تَوفِیقی اِلَّا بِاللّٰہِ

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁